باادب
بامُحاورہ
ہوشیار!
(طنز و مزاح)
نادر خان سَرگِروہ

با اَدب
با مُحاورہ
ہوشیار!

طنز و مزاح

نادر خان سَرگِروہ

پرِنٹ زون نزد پنجاب نیشنل بینک، بِشٹوپور، جمشید پور، ۸۳۱۰۰۱، اِنڈیا
Email: printzoneindia@hotmail.com Contact: +91 9431 962168

طبعِ اول : جنوری 2012ء (بھارت)

طبعِ دوم : فروری 2012ء (پاکستان)

صفحات : 96

تعداد : 500

سرورق : محمد مختار علی

ناشر : پرنٹ زون، جمشید پور، انڈیا

قیمت : -/150 روپے

20 سعودی ریال

Baa-Adab Baa-Muhawara Hoshiyar
By Nadir Khan Sargiroh

P.O.Box 7797 Makkah. KSA

کتاب پر تبصرے اور اس سے متعلق دیگر معلومات کے لیے لاگ آن کریں:

- www.urdugulban.com
- www.urduanjuman.com
- www.deedahwar.net

E-mail: nadirsargiroh@yahoo.com
baa_muhawara_hoshiyaar@yahoo.com

والدین کے نام

جن سے لکھنا پڑھنا اور دنیا میں چلنا سیکھا

اپنے ماموں جان مرحوم داؤد عبدالملک خان سَر۔گروہ کے نام

جن کی باتوں کو یاد کر کے لوگ آج بھی مسکراتے ہیں

ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال کے نام

جنہوں نے تینتالیس سال پہلے طنز و مزاح کے ایک اہم ستون ماہنامہ 'شگوفہ' کی بنیاد رکھی اور آج تک اُسے ۔گرنے نہ دیا۔ظرف ایسا کہ بے شمار لوگوں کی تحریریں برداشت کیں اور ضبط ایسا کہ خود مزاح نہیں لکھتے۔

اور

میرے اَدبی سفر کو ایک نیا موڑ دینے والے دوست

نعیم جاوید کے نام

میرے ہمزاد

پُر جوش پُوری

کی دعا

''اِن تحریروں سے قارئین کے چہرے پر بکھرنے والی مسکراہٹیں
نادِر خان سَر گروہ کی مغفرت کا باعث بنیں۔''

(آمین)

فہرست

تقاریظ

شرارتِ قلم

خاکہ

کچھ تفریح، کچھ معلومات ...INFOTAINMENT

مصنف ایک نظر میں!

نام : نادِرخان سَر گِروہ

والد کا نام : بدرالدین خورشید خان سَر گِروہ (سبک دوش ملازم، فُوڈ کارپوریشن آف انڈیا)

آباواَجداد : تُرک...... جنہیں فوج میں خدمات انجام دینے پر سنہ گیارہ سونوّے ہجری میں سَر گِروہ (گِروہ کے سَردار) کے خطاب سے نوازا گیا

آبائی وطن : پیوے، تعلقہ گہاگر، ضلع رتنا گیری (کوکن) مہاراشٹر (بھارت)

تاریخِ پیدائش : 4 جولائی 1971ء

جاے پیدائش : ممبئی (مہاراشٹر، بھارت)

اسکول/ کالج : ایم ایچ صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ، ممبئی

سب سے پہلی تحریر
کب اور کہاں
شائع ہوئی : ● کل اور آج (افسانہ) جون 1989ء (روزنامہ اُردو ٹائمز ممبئی)

● اُونٹ پہاڑ کے نیچے (فکاہیہ) 2006ء (ماہنامہ 'شگوفہ' حیدرآباد)

صنفِ سخن : نثر (طنزیہ و مزاحیہ)

تصنیف : بااَدب بامحاورہ ہوشیار!

خاندان میں شاعر و اَدیب	:	دُور دُور تک کوئی نہیں
مقیم حال	:	مکۃ المکرمہ (سعودی عرب)
ای میل	:	nadirsargiroh@yahoo.com

آخری پیش لفظ!

طنز و مزاح کے ایک گنہگار کی حیثیت سے مجھے اکثر مزاحیہ کتابوں کی رسمِ اجرا انجام دینی پڑتی ہے، یا پھر کسی مصنف کی فرمائش پر دیباچہ لکھنا پڑتا ہے۔ 'باادب بامحاورہ ہوشیار' کے تعارف و تعریف کے سلسلے میں یہ چند سطور لکھتے ہوئے میں ایک نئے قسم کے تجربے اور احساس سے دوچار ہوں۔ کتاب کا نام ایسا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے روزمرّہ کے کپڑوں میں اس کا پیش لفظ لکھوں یا دَستار بگلوس لگا کر شاہانہ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ شایانِ شان جملے تحریر کروں، غرض یہ مختصری تحریر پیش لفظ سے زیادہ پس و پیش لفظ ہے۔

اِس کتاب کا اپنے مصنف سے گہرا تعلق ہے۔ مزاح نگار کے تمام موضوعات 'نادر' ہیں اور اس کے قلم میں اِتنا دَم ہے کہ اگر یہ اپنے مشغلے کو جاری رکھے تو بہت جلد مزاح نگاروں کا 'سَر بَرگروہ' بن جائے گا اور پختہ کار مزاح نگاروں کو ایمرجنسی میں اپنے معدے کی 'اِنڈوسکوپی' کروانے کی بجائے، اپنے پیٹ کی 'انڈا اسکوپی' کرانا پڑے گی۔

پطرس بخاری سے لے کر مشتاق احمد یوسفی تک کئی مزاح نگاروں نے اپنے ہمزاد ساتھ رکھے ہیں۔ نادر خان سَر بَرگروہ کا ہمزاد پُر جوش پُوری بھی ہمیشہ مصنف کے ساتھ پاسبانِ عقل کی طرح لگا رہتا ہے اور کبھی اسے تنہا نہیں چھوڑتا۔

نادر خان سَر بَرگروہ کی سب سے بڑی خوبی اُن کے موضوعات کا انوکھا پن ہے۔ مشہورِ زمانہ مصرعوں اور محاوروں کے استعمال، بلکہ تصرفات سے قاری کو ایک طرح کی استعجاب آمیز مسرت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے 'ہنوز بِلّی دُور اَست'، 'کینگرو کی ماں کب تک خیر منائے گی'، 'اُونٹ پہاڑے کے نیچے' وغیرہ۔ چوہوں کے بارے میں نادر خان کا ارشاد ہے، "کاش! اِن کا بھی یہ شیوہ ہوتا کہ، گھروں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل۔"

شادی بیاہ کے موقعوں پر دُلہا والے دُلہن کے گھر اپنی ایسی تصویروں کا تبادلہ کرتے ہیں، جن میں حتی الامکان یہ ظاہر ہو کہ 'مجھ میں وہ بات کہاں، جو مری تصویر میں ہے'۔ نادر خان کے دفتر

کے چپراسی نے ایسی تصویر بھیجی تھی، جس میں وہ اپنے باس کی کرسی پر بیٹھا تھا، لیکن اُس سے یہ بھول ہو گئی تھی کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے جھاڑن نہیں چھوڑی تھی (قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا!)۔ ہم نے ایک زمانہ میں آٹو رکشائی تحریروں پر ایک کالم لکھا تھا، نادر خان سَر۔گروہ ہم سے کئی قدم آگے نکل گئے اور 'ٹرکی ادب' پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ ہم نے دو چار مصرعوں پر ہی اکتفا کیا تھا، لیکن مصنف نے ٹرکوں کا دیوان مرتب کیا ہے۔

جانوروں کی دُم کے بارے میں نادر صاحب کی معلومات اتنی باریک ہیں کہ حیوانات کے ڈاکٹر بھی اِن کے آگے زانوئے اَدب، بلکہ چوپائے اَدب تہ کر سکتے ہیں۔ اُن کی تحقیق یہ ہے کہ دُم کے ہونے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جانور اَب یہاں آ کر ختم ہو چکا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ جانوروں کی ستر پوشی اور مکھیاں اُڑانے کا کام بھی کرتی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے لکھا تھا کہ 'طوائف الملوکی' کے صحیح معنی اُن کو بہت بعد میں معلوم ہوئے، ورنہ وہ اِس لفظ کا کچھ اور مطلب سمجھ بیٹھے تھے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ نادر صاحب عرصہ دراز تک 'مَرغزار' کو 'مُرغ زار' پڑھتے تھے اور اِس سے پولٹری فارم مطلب نکالتے تھے۔

اب تک ڈاکٹر، مریض کے پیٹ میں آلاتِ جراحی رکھ کر بھول جاتے تھے، لیکن مصنف کا سابقہ ایسے سرجن سے پڑ چکا ہے، جو مریض کے پیٹ میں موبائل فون رکھ کر بھول گیا تھا۔ جب موبائل فون کی گھنٹی بجی تو ڈاکٹر خوش ہوا کہ انسان کے پیٹ کے اندر بھی موبائل کے سگنل جاتے ہیں۔

کتاب کے مضامین جنوری 2004ء سے جون 2010ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اِن مضامین میں فن اور زبان و بیان کے ارتقا کی کیفیت ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ نادر خان سَر۔گروہ کا فن روز بروز ترقی کرے گا اور اِن کو آئندہ کسی کے پیش لفظ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

مجتبیٰ حُسین
حیدرآباد دکن (بھارت)
20 فروری 2011ء

نادِرشاہی انداز

نادِرخان سَرگروہ کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'باادب بامحاورہ ہوشیار' دیکھا تو دل نے کہا:

اِک اور مسخرہ مری محفل میں آگیا

لیکن جب پڑھنا شروع کیا تو پڑھتے پڑھتے ''مسخرہ'' نابغے کا رُوپ دھارتا نظر آیا، تو دل نے پینترا بدل کر کہا:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

اپنے ایک مضمون 'چھوٹے موٹوں کا بچپن' میں موصوف نے لکھا ہے، ''ایک زمانہ تھا کہ انسان ہوتے ہوتے موٹا ہوتا تھا۔ لیکن اب؟......ہوتے ہی موٹا ہوتا ہے۔''

اِن کا پہلا مجموعہ بھی اُس بچے کے مصداق ہے کہ طنز ومزاح میں جو پختگی آتے آتے آتی ہے وہ 'طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے' کی مثال بن کر ہمارے سامنے ہے۔

تقریباً نصف صدی پیشۂ تدریس سے وابستگی اور طلبا کی کاپیوں کی تصحیح کے عمل نے طبیعت میں ہر تحریر میں فی نکالنے کا وہ داعیہ پیدا کر دیا ہے کہ اگر کوئی تحریر اغلاط سے مُبرّا نظر آئے تو مایوسی ہوتی ہے اور اپنی مشیخت کی شکست کے احساس کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مشورہ انگریزی کے اس مقولے کے تحت ضرور دیا جاتا ہے کہ:

"There is always room for improvement"

چنانچہ نادرخان کے نونِ مُعلن کے نقطے پر نکتہ چینی کے علاوہ اگر قابلِ تصحیح کوئی چیز نظر آئی تو وہ

محض پُروف کی اغلاط تھیں، جن کے بارے میں ایک بار جناب مشتاق احمد یوسفی نے فرمایا تھا کہ وہ تو کوئی ایسی تحریر پڑھتے ہی نہیں، جس میں پُروف کی اغلاط نہ ہوں، کیوں کہ اُن کی موجودگی میں قاری رُک کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ورنہ روانی میں بغیر سمجھے پڑھتا چلا جاتا ہے۔

قدیم و جدید طنز و مزاح نگاروں میں رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی دو بلند مرتبہ نام ہیں، جن کا مزاح قدم قدم پر قاری کی اپنی استعداد کا امتحان لیتا ہے۔ دونوں حضرات کی زبان کا معیار بھی فکر کی مانند بلند ہے اور ہر کہ ومہ اُن کی تحریروں سے لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ ایک اوسط استعداد کا مالک قاری بھی بعض اوقات لغت کھولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن نادر خان سَر گِروہ نے قاری کی کم فہمی کے پیشِ نظر ''کافر نہ تواں باشی ناچار مسلماں شو'' کے مصداق زبان آسان استعمال کی ہے، جو سادگی و پُرکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

نادر خان سَر گِروہ طنز و مزاح نگاری کے جملہ لوازِم کے ساتھ میدانِ اَدب میں اُترے ہیں۔ اُن کے یہاں دلچسپ تصرُّفات بھی ہیں۔ مثلاً 'دُم سا نہیں دیکھا'، 'حرکتِ کلب بند نہیں ہوتی'، 'ایسے مَردوں کو مُردہ کہنا بے جا نہ ہوگا، جو جہیز کے بدلے اپنے ضمیر اور اپنی رُوح کو بیچ دیتے ہیں'، 'دیر آید دُرشت آید' اور 'جُوتیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا'۔ یا لفظوں کے اُلٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنا، جیسے ''قلمبند کر کے ہی قلم بند کرتے ہیں۔'' یا بات سے بات نکال کر مزاح پیدا کرنا، جیسے ''اب وہ جھاڑ پھُونک کا کام کریں گے۔ یعنی فلسفہ جھاڑیں گے اور اپنی جمع پونجی پھُونکیں گے۔'' یا ''ہم نے زندگی میں کئی تصویروں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، لیکن کبھی ہمیں تصویر کا دوسرا رُخ نظر نہ آیا۔'' یہ چند مثالیں مُشتے اَز خروارے کے مصداق پیش کی گئی ہیں۔

مزاح میں ایک مسئلہ ناگفتنی کو گفتنی بنا کر پیش کرنے کا ہے۔ میؔر کے الفاظ میں:

شرط سلیقہ ہے ہر اِک اَمر میں
عیب بھی کرنے کو ہُنر چاہیے

مثال کے طور پر اپنے مضمون 'ہشیار باش' میں خفیہ کیمروں کی کارکردگی کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ''بیوٹی پالرز یوں تو بُری جگہ نہیں ہوتی۔ لیکن کچھ بیوٹی پارلرز 'فریب خانے' ہوتے ہیں

۔خواتین وہاں احتیاط اختیار کریں، خصوصاً ایک لباس سے دُوسرے لباس میں منتقل ہوتے وقت۔ بے قبائی کے وہ لمحات کہیں رُسوائی کا سبب نہ بن جائیں۔'' اس طرح بات سے بات پیدا کرنے کا فن، جس کے ماہر خواجہ حسن نظامی تھے، اِس کے بھی نمونے نادر خان سَر گروہ کے یہاں ملتے ہیں۔

غرضیکہ جیسا شروع میں عرض کیا گیا، نادر خان سَر گروہ طنز و مزاح نگاری کے جُملہ اسلحہ سے لیس نادر شاہی انداز میں میدانِ اَدب میں اُترے ہیں۔ وہ ہمارے معاشرے کے سُلگتے ہوئے مسائل سے تعرُّض کرتے ہیں، لیکن ایسے مضحک انداز میں، جسے زہر خند کہنا مناسب ہوگا۔ مزاح کی پَرت کے نیچے دلِ تپیدہ کی جھلک اس طرح محسوس ہوتی ہے، جیسے پھلجھڑی چل رہی ہو، کہ جھڑتے ہوئے رنگ برنگ ستاروں کے نیچے تار پر لپٹا ہوا سُرخ ہالہ۔

نادر خان سَر گروہ آرکی ٹیکچر کے پیشے سے جُڑے ہیں۔ چنانچہ اُن کی عبارتوں میں بھی توازن اور تناسب، تاج محل کی یاد دِلاتا ہے۔ لفظوں کا تاج محل۔ اُن کے تیوَر بتا رہے ہیں کہ اگر اُنہوں نے اِسی محنت اور لگن سے اپنا اَدبی سفر جاری رکھا تو اُن کا شمار صفِ اوّل کے مزاح نگاروں میں ہوگا۔ اِن شاءاللہ!

پروفیسر عنایت علی خان

حیدر آباد (پاکستان)

15 جنوری 2011ء

دلچسپ، شگفتہ مضامین

جدید اُردو اَدب میں ایسے ناموں کی کمی نہیں، جو اُردو کے لسانی اور تہذیبی معاشرے سے دُور رہ کر بھی اُردو کے تخلیقی سلسلے سے وابستہ ہیں۔ شاعری، تنقید اور افسانہ تو اکثر نظر سے گزرتے رہتے ہیں، لیکن دیارِ غیر میں تمام مسائل اور اجنبیت کے بعد بھی حسِ مزاح کتنی باقی رہتی ہے، اس کا اندازہ کم ہی ہو سکا ہے۔ مزاح نگاروں کی چند ایک تحریریں آ جاتی ہیں تو اس کوچے کے باشندوں کو بھی 'درجِ گزٹ' کر لیا جاتا ہے۔ اِس وقت میرے پیشِ نظر نادر خان سَر گِروہ کی کتاب 'باادب بامحاورہ ہوشیار' کا مسودہ ہے۔ اس میں مختصر، لیکن دلچسپ شگفتہ مضامین شامل ہیں اور اِن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "یہ مٹی بہت ہی نم، بہت زرخیز ہے ساقی۔"

وہ جو کہا گیا ہے کہ مزاح لکھنے کے لیے انسان کو اوّل تا آخر مزاح نگار ہی ہونا چاہیے، چنانچہ نادر خان سَر گِروہ میں حسِ مزاح تو ہے ہی، تاہم یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اُردو کے مزاحیہ اَدب کا غائر مطالعہ کیا ہے اور اپنے لیے الگ راہ نکالی ہے۔

اُن کی اِن ابتدائی تحریروں سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ اگر وہ دلجمعی سے لکھتے رہے تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ اُردو کے مزاحیہ اَدب کو مستقبل میں ایک اچھا مزاح نگار مل جائے گا۔

میں خوش فکر شاعر اور اِس عہد کے ایک اہم بیدلؔ شناس ڈاکٹر سیّد نعیم حامد علی الحامد کا ممنون ہوں کہ اُن کے توسط سے مجھے 'باادب بامحاورہ ہوشیار' جیسی دلچسپ کتاب پڑھنے کو ملی۔

پروفیسر سحر انصاری
کراچی
12 فروری 2011ء

ایک اور نمکدان

نادر خان سَر۔گروہ کافی دنوں سے اپنے مضامین کا مجموعہ چھپوانے کے لیے سرگرداں تھے۔ الحمد للہ، آخر کار نثری طنز و مزاح کی یہ شگفتہ کتاب چھپ کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ ہی گئی۔ طنز و مزاح میں آج کل 'انتخاب' پر زیادہ زور ہے۔ اِدھر اُدھر سے معروف ادیبوں اور شعرا کے چھپے ہوئے مواد کو جمع کر کے چھپوا دینا آج کل ایک اچھا مشغلہ ہے اور ظاہر ہے مفید بھی۔ مگر طبع زاد مضامین قارئین تک کتابی صورت میں پہنچانا کارِ دارد۔

موصوف صرف ایک اچھے مزاح نگار ہی نہیں، بلکہ ایک زبردست مزاح پَرست بھی ہیں۔ سب ہی معروف مزاح نگاروں سے اِن کی بہت اچھی سلام دعا ہے، اگرچہ زیادہ تر حضرات سے اِن کی ملاقات صرف غائبانہ ہے۔ مزاحیہ نثر و نظم کا کوئی شہ پارہ، یا نمک پارہ اِن کے ہاتھ لگ جائے تو اسے پارہ پارہ کیے بغیر نہیں چھوڑتے ...... اور ماشاءاللہ حافظہ اس کمال کا ہے کہ اگر ایک مزاح نگار دوسرے مزاح نگار کے لکھے ہوئے جملے اپنے کسی مضمون میں بلا سیاق و سباق شامل کر لے تو یہ اُسے فوراً پکڑ لیتے ہیں۔

اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں، ذاتی طور پر مجھے سب ہی اچھے لگے اور ان سب میں کچھ نہ کچھ نیا لگا، یعنی بقول شخصے ...... یہ مضامین ذرا ہٹ کر ہیں۔ مضامین کے عنوانات بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، جن سے اِن کی In-built ندرتِ خیال کا اندازہ ہوتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی اپنی کتاب 'چراغ تلے' میں لکھتے ہیں، ''میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہنسنے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ پھر وہ اتنے بُرے نہیں معلوم ہوتے۔'' کروڑوں سال پرانی اِس دنیا میں آدمی اپنی زندگی کے ساٹھ ستر سال کس مشکل سے گزارتا ہے یہ اُس کا دل ہی جانتا ہے۔ ایسے میں کوئی قہقہوں کی دولت بانٹتا ہے تو ہمیں اُس کا احسان مند ہونا چاہیے۔

نادر خان سَر گروہ بھی یہ نیک کام بڑی خوش اسلوبی سے کر رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی طنز و مزاح کے میدان میں ان کو مزید کامیابیاں عطا کرے۔

شوکت جمال
ریاض (سعودی عرب)
27 جنوری 2011ء

پُر پیچ لفظ

ایک زمانہ تھا جب لطیفے رفتہ رفتہ اپنا اثر دِکھاتے تھے۔ ایک ملک کے لطیفے بمشکل دوسرے ملک کی سرحد میں داخل ہو پاتے تھے۔ تب لوگ ایک ہی لطیفہ کئی کئی مرتبہ سنتے اور اُسے سوچ سوچ کر مدتوں ہنسا کرتے تھے۔ پہلے کسی مضمون میں چند سطروں کا مزاح پڑھ کر قاری کے پیٹ میں بَل پڑ جاتے تھے، لیکن آج کا قاری ہر جملے میں مزاح دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اِتنا سن اور پڑھ چکا ہے کہ اُس کے ذہن تک مزاح کی کھیپ پہنچانے کا راستہ بڑا ہی دُشوار ہو گیا ہے۔ اب لطیفہ طرازی اِتنے عروج پر ہے کہ قدم قدم پر لطیفے تراشے جانے لگے ہیں۔ کوئی اپنا دُکھڑا روتا ہے تو موضوع کا رُخ مزاح کی طرف موڑ کر ہنسی مذاق کی گنجائش نکال لی جاتی ہے۔ کوئی ناسازیِ طبع کا ذکر کرتا ہے تو لوگ اُس رُوداد میں بھی کوئی نہ کوئی نکتہ نکال کر حظ اُٹھاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جنازے میں شریک بعض لوگ قبرستان میں بھی باز نہیں آتے، میت کو قبر میں اُتارتے وقت کوئی فقرہ ایسا کستے ہیں کہ سب روتے روتے ہنس پڑتے ہیں۔ ملک کے حالات بدترین ہوں یا قوم مسائل میں گھری ہو، لوگ اِن سب باتوں کو لطیفے کے مرغولے بنا کر ہنسی کے دُھویں میں اُڑا دیتے ہیں۔ اِن حالات میں میری کتاب کا اضافہ ہوا ہے، یعنی کتابی کیڑوں کی غذا کا اہتمام ہوا ہے۔

مشکل زبان مجھے آتی نہیں، مجبوری تھی۔ لہٰذا آسان زبان میں بات کو مشکل بنا کر لکھنے کی کوشش کی ہے، تا کہ بھرم رہے۔ طنز و مزاح پر مبنی یہ کتاب آپ کے خاندان کا ہر فرد بلا تردُّد پڑھ سکتا ہے۔ مَیں نے اِس میں کوئی 'بَد تمیزی' نہیں کی ہے اور نہ بیگم کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہے۔ بیگم، سالا، سالی، ساس، سُسر، اکثر طنز و مزاح کا لازمی جزو رہے یہ روایتی کردار آپ کو اِس کتاب میں ڈھونڈے نہ ملیں گے۔

میں نے لکھنے کی ابتدا افسانوں سے کی تھی، لیکن وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ انٹرنیٹ کے

جزیروں کی سیر کیا کی، طنز و مزاح کے جن کا سایہ مجھ پر پڑ گیا۔ مہتاب قدر کی ویب سائٹ 'اُردو گلبن ڈاٹ کوم' اور ماہنامہ 'شگوفہ' حیدر آباد دکن سے مزاحیہ مضامین لکھنے کی شروعات کی۔ ہم عصر جواں سال اُدیبوں اور قارئین کی طرف سے اچھے تاثرات ملنے لگے۔ لوگوں نے 'زورِ قلم اور زیادہ' کی دعائیں دیں اور میں نے 'زور' قلم پر ہی دیا۔ کاش! لوگ مجھے ذہن پر زور دینے کی دعائیں دیتے!

میں اُن تمام کرم فرماؤں کا ممنون و شاکر ہوں، جنہوں نے اِس کتاب کی تکمیل کے مختلف مراحل میں میری حوصلہ افزائی کی۔ یہاں ایک خالی خانہ (............) چھوڑ رہا ہوں۔ سب اِسے اپنے اپنے نام سے پُر کرلیں، تاکہ کسی نام کے چھوٹ جانے یا تاخیر و تقدیم میں بدنظمی اور بدنیتی کا الزام میرے سَر نہ آئے۔

آخر میں اُس شخصیت کا شکریہ ادا کرنا کیسے بھول سکتا ہوں، جس نے میری اُوٹ پٹانگ تحریروں کو صبح و شام اور شب و روز برداشت کیا۔ اُس نے اُن فضول سطروں کو بھی پڑھنے کی زحمت اُٹھائی، جنہیں میں اِس کتاب سے حذف کر چکا ہوں۔ میں اُس شخصیت کی بات کر رہا ہوں جو میرے ساتھ زندگی کی کتاب کے صفحات پلٹ رہی ہے!

اب آپ کتاب پڑھیے! اور سَر دُھنیے (اگر کہیں میں آپ کے ہاتھ لگ جاؤں)۔

نادر خان سَر گروہ
مکۃ المکرمہ (سعودی عرب)
2 فروری 2011ء

شرارتِ قلم

''راستہ بھول گیا، یا مِری منزل ہے یہی''

زبان ہے تو جہان ہے

آج ہم زبان پر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہے نا عجیب بات؟ زبان سے یا تو کچھ کہا جاسکتا ہے یا کسی زبان میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اگر ہم زبان پر کچھ کہیں گے تو آپ زبان پر حرف لائیں گے۔

بات جب زبان کی چل نکلی ہے تو کیا حرج ہے کہ زبان پر زبان درازی کی جائے۔ زبان کی بہت سی قسمیں ہیں۔ میٹھی، تیکھی، کڑوی، موٹی، کالی اور لمبی زبان۔ جانوروں کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم اُنہیں بے زبان کہتے ہیں۔ اگر ہمیں چینیوں کی زبان سمجھ میں نہ آئے تو کیا ہم اُنہیں بے زبان کہیں گے؟ چین میں سب کچھ بنتا ہے۔ سب سے زیادہ انسان بھی وہیں بنتے ہیں اور سب کے سب ایک جیسے۔ سب چینی صرف چینی بولتے ہیں۔ چینی زبان میں سے اگر حرف 'چ' نکال دیا جائے تو کوئی بھی چینی...... چینی نہ بول سکے گا۔ بولنا تو دُور کی بات، وہ چُوں بھی نہ کر سکے گا۔

ہاں! تو ہم بات کر رہے تھے جانوروں کی زبان کی۔ اِن بے زبانوں کا ہماری زبان میں بہت دخل ہے۔ بے شمار ضربُ الامثال، محاورے اور کہاوتیں اِن ہی چرند و پرند کی دین ہے۔ مثلاً، آ بیل مجھے مار، بلّی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں، بندر بانٹ، ہاتھی کے دانت،

کھانے کے اور دکھانے کے اور، مگر مچھ کے آنسو، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ وغیرہ وغیرہ۔شکر ہے جانور پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، ورنہ آج وہ سب مل کر یہ دعویٰ کرتے کہ ''اُردو 'ہماری' زبان ہے!'' کاش! وہ پڑھنا لکھنا جانتے۔ کوئی تو ہوتا جو یہ دعویٰ کرتا کہ...... ''اُردو ہماری زبان ہے۔''

دنیا کی ہر مخلوق منہ میں زبان رکھتی ہے۔ اگر یہ زبان نہ ہوتی تو دنیا میں کوئی زبان نہ ہوتی۔ جب کوئی زبان نہ ہوتی تو عورتوں کی زبان تالو سے لگی رہتی، نہ بات پیٹ میں جاتی نہ باہر آتی۔ تب اُن کے کرنے کے لیے کوئی کام نہ رہتا۔ زبان نہ ہوتی تو ذائقہ نہ ہوتا۔ عورتوں کے لیے شوہر کے پیٹ سے اُس کے دل کو جانے والی 'وہ' راہ گزر سرے سے ہی نہ ہوتی۔ دنیا سیاستدانوں کی آلائش و فتنہ پَردازی سے محفوظ ہوتی۔ بعض سیاستداں بھی عجیب ہوتے ہیں، بہت زبان لڑاتے ہیں۔ اب دیکھیں نا! اُردو کو پنجابی سے لڑا دیا، تامل کو سنبھالی سے۔

سب سے بھاری زبان، ملیالم زبان ہے۔ پھر بھی مالاباری اِسے دنیا کے کونے کونے میں اُٹھائے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مریخ پر بولی جانے والی پہلی زبان یہی ہوگی۔ ایک بار ہم نے اپنے کیرالا کے دوست سے پوچھا، ''ملیالم سیکھنے کا سب سے آسان طریقہ کیا ہے؟'' اُس نے ایک سو بیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جواب دیا، ''اِم پوسیبل مسٹر کھان! اِس کام کے لیے آپ کو مَمی مَم ایک بار کیرالا میں پے دا (پیدا) ہونا ضروری اے، جو آپ کے بس کا بات نَیں اے۔'' اُس کا یہ جواب سُن کر ہم نے ملیالم سیکھنے کا ارادہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ترک کر دیا کہ یہ دنیا صرف ایک بار ہی دیکھنے کی جگہ ہے اور زندگی کا سفر اِتنا آسان نہیں جو بار بار کیا جائے۔

زبان کا اپنا کوئی وزن نہیں ہوتا، مگر یہ اپنے مالک کا وزن بتاتی ہے، بڑھاتی ہے، گھٹاتی ہے۔ زبان طبعی حالت میں کبھی کروٹ نہیں بدلتی، لیکن دوسری حالت میں کب کروٹ بدلے، کہا نہیں جا سکتا۔ کمان سے نکلا تیر واپس آ سکتا ہے، مگر زبان سے نکلا لفظ نہیں۔ تیر کا کیا ہے؟ کسی کو بھیج دیں، اُٹھا کر لے آئے گا، لیکن لفظ ڈُھونڈ کر لانا ناممکن ہوتا ہے۔ کیوں کہ لفظ کبھی دماغ میں بیٹھ جاتا ہے تو کبھی دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔

اُردو لشکری زبان ہے۔ الفاظ اِس میں فوج در فوج داخل ہوئے ہیں۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے، بلکہ کثیر الاقوام افواج اِس پر بظاہر قابض ہو گئیں ہیں اور اُردو کے کچھ الفاظ جنگی قیدیوں کی مانند لغت میں قید ہو کر رہ گئے ہیں:

"کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے"

اُردو والے اب پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں اور اپنے اپنے لہجے میں اُردو کی بقا کی بات کر رہے ہیں۔

سیلز مینوں کی زبان چار ہاتھ کی ہونا ضروری ہے۔ اور اگر اُنھیں تیل بیچنا ہو تو فارسی پر عبور حاصل ہونا ضروری ہے، لیکن آج کل فارسی والے یورینیم افزود کر رہے ہیں اور انگریزی والے اِس عمل پر پابندی لگانے کے لیے یورینیم سے زیادہ خطرناک مواد استعمال کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ خدا جانے حقیقت کیا ہے۔

کچھ سال پہلے تک ہماری اُردو بس ایسی ہی تھی، لیکن اتنی بُری نہیں تھی، جتنی کہ اب ہے۔ اُس زمانے میں ہم گاہ بہ گاہ اُردو میں متبادل الفاظ کا اضافہ کرتے رہتے تھے۔ مثلاً، ایسی جگہ جہاں بندروں کے جھنڈ رہتے ہوں، ہم نے اُس جگہ کا نام 'بندر گاہ' رکھا تھا۔ دفتر میں ہمیں ڈیوٹی کے دوران اکثر خواب دکھائی دیتے تھے، اِسی لیے ہم دفتر کو 'خواب گاہ' کہتے تھے، جب کہ ہمارے ایک غیر ملکی دوست جو بڑے محنتی تھے۔ وہ اپنے دفتر کو 'عبادت گاہ' کہتے تھے۔ چڑیا گھر کا نام بھی ہم بدل دینا چاہتے تھے، کیوں کہ جب جب ہم چڑیا گھر گئے، وہاں ہم نے کوئی اور ہی مخلوق دیکھی۔ گھر تو چڑیا کا، پر قسم قسم کے جانور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں وہاں خیمہ زن تھے۔ لیکن برسوں ذہن لڑانے کے بعد بھی ہم چڑیا گھر کو کوئی اور نام نہ دے سکے۔ یوں بھی صرف نام بدل دینے سے کیا ہو جاتا؟ حیف صد حیف! ہمارا ملک بھی کبھی سونے کی چڑیا کا گھر تھا!

صاحبو! اگر ہم اپنے کارنامے بیان کرنے لگیں تو آپ سے ہماری زبان پکڑی نہ جائے گی۔ زبان قینچی کی طرح چلے گی اور بات سے بات نکلتی جائے گی۔ یوں بھی زبان پر جتنا کہا جائے، کم ہے۔

بس یہ کہہ کر ہم اپنی زبان سمیٹ لیتے ہیں کہ آپ اپنے بچوں کو چاہے جس زبان میں تعلیم دیں، مگر اُردو کی شیریں ڈلیاں بچپن سے ہی اُن کی زبان پر رکھتے جائیں، تا کہ وہ اُردو کی مٹھاس سے آشنا ہوں۔ اور جب وہ بڑے ہوں تو اُن کی زبان سے پھول جھڑیں اور اُردو کی مہک سارے عالم کو یوں ہی مدمست کرتی رہے...... مدہوش کرتی رہے۔

(اپریل، دو ہزار سات)

نٹ کھٹ روزہ دار

کھانا پینا ہمارے لیے کتنا ضروری ہے، اِس کا علم ہمیں تب ہوا، جب ہم سے پہلا روزہ رکھوایا گیا۔ بچپن میں رمضان کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کا ذکر ہے کہ ہم روزے سے تھے اور افطار کی منزل ابھی دُور تھی۔ ہماری والدہ پاس بیٹھی چاول چُن رہی تھیں کہ بے خیالی میں ہم نے چاول کی ایک چٹکی اُٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ والدہ نے جھٹ یاد دلایا کہ ہمارا روزہ ہے۔ ہمیں بڑا افسوس ہوا کہ کہیں روزہ تو نہیں ٹوٹ گیا۔ پھر اُنہوں نے اطمینان دلایا کہ نہیں! اگر بھول سے کچھ کھا لیا تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ یہ جان کر ہمیں پہلے سے بھی زیادہ افسوس ہوا کہ کاش ہم بھول سے ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا سا گلاس پی گئے ہوتے! کوئی فرحت بخش شربت ہی منہ میں اُنڈیل گئے ہوتے! اُس کے بعد ہم نے کئی روزے رکھے اور چاہا کہ بھول جائیں کہ ہم روزے سے ہیں، لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب لوگ ہمیں چاند کہتے تھے۔ تب ہم یہ سمجھتے تھے کہ چاند صرف سال میں دو مرتبہ ہی نظر آتا ہے۔ وہ بھی اِتنا سا؛ ہمارے ناخن سے بھی چھوٹا!......اور ذرا ترچھا۔ اِس کے علاوہ بھی ہم نے کئی بار پورا پورا چاند بھی دیکھا، لیکن کسی کو اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی

دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب کہ رمضان وعید کا چاند نظر نہ آئے تو بھی ہم نے بہت سوں کو بڑے اہتمام کے ساتھ دیکھتے ہوئے دیکھا ہے، بلکہ شہادت دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ہم بھی یہ دونوں چاند بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے دو، دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے مسجد کی چھت پر چڑھ جاتے اور جہاں سَر اُٹھایا وہیں چاند تلاش کرنے لگتے۔ وہاں ...... شام کے دُھندلکے میں ہر بچہ الگ الگ سمت میں چاند ڈھونڈتا نظر آتا۔ گویا ہر بچے کے لیے الگ الگ چاند نکلنے والا ہو۔ ہماری کیفیت دیکھ کر کوئی بڑا ہمیں گود میں اُٹھا کر اُنگلی کے اشارے سے چند درختوں کے پیچھے آپس میں گتھم گتھا بجلی اور ٹیلی فون کے تار دِکھاتا۔ پھر آسمان سے فضول باتیں کرتی اُونچی اُونچی عمارتیں اور اُن کے بیچ میں سے خالی جگہ تلاش کر کے گھوڑوں، پہاڑوں اور غُباروں کی شکل کے بادل دِکھاتا۔ ہم اِس تمہید پر بے چین ہو جاتے۔ اِتنا سب کچھ دکھانے کے بعد وہ ہماری پلک جیسی کوئی چیز دکھا کر کہتا، ''دیکھو بیٹا! یہ وہی چاند ہے جس کا تمہیں سال بھر سے انتظار تھا۔ ہم سراُوپر اُٹھائے ایک ہاتھ سے اپنی ٹوپی سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں چپل تھامے وہ نازک سا، ترچھا چاند دیکھتے، جسے دیکھ کر ایسا لگتا کہ اب گِرا...... جب گِرا۔ لیکن چاند سے زیادہ ہمیں اپنی ٹوپی کے گِر جانے کا ڈر رہتا، کیوں کہ گھر لوٹنے پر ہم سے کوئی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ کتنی رکعتیں پڑھیں؟ امتحانوں میں کامیابی کے لیے دعا مانگی یا نہیں؟ وہاں تو سب سے پہلا سوال ٹوپی اور چپل کی سلامتی کے متعلق ہوتا تھا۔ ہاں تو!...... بڑوں کے ساتھ جب بھی ہم چاند دیکھتے تو اُن ہی کے طریقے سے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکیڑ کر چاند کی طرف دیکھتے، پھر اُن کی طرف دیکھتے۔ وہ اگر آنکھوں کے آگے ہاتھ سے سائبان بناتے تو ہم بھی تھوڑی دیر کو اپنی ٹوپی چھوڑ کر اپنا ہاتھ آنکھوں کے اُوپر رکھ کر چھوٹا سا سائبان بناتے۔ لیکن جب ہم بڑے ہوئے تو یہ کُھلا کہ یہ دُور کی چیزوں کو قریب دیکھنے کا کوئی جدید فارمولا نہیں ہے، بلکہ بڑے بوڑھے اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ آہ! ہم نے بڑوں کی بعض عادتوں کی تقلید میں اپنا بچپن بہت ضائع کیا۔

ہمارے دوست پُر جوش پُوری؛ اُس وقت ہم سے ایک دو سال بڑے ہوں گے۔ وہ بچپن میں روزے کم ہی رکھتے، مگر اکثر روزہ داروں جیسی شکل بنائے پھرتے اور روزہ دار کو جو مراعات

حاصل ہوتیں وہ پوری پوری استعمال میں لاتے، جب کہ......

ہم نے اُن کو بھی چُھپ چُھپ کے کھاتے دیکھا ہے گلیوں میں

ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ افطار کے وقت دسترخوان پر وہی سب سے زیادہ ڈٹ کر کھاتا ہے جس نے روزہ نہیں رکھا ہوتا۔

اُن دنوں ہمیں کبھی کبھار محلے کی مسجد میں افطار کرنے کے مواقع بھی ملتے۔ مسجد کی بالائی منزل پر چھوٹی بڑی تھالیوں میں قسم قسم کے پکوان سجائے جاتے۔ افطار شروع ہوتے ہی بچے اُن پکوانوں کو تھالیوں کے باہر بھی سجا دیتے۔ ہر بچہ پورے کا پورا...... اُن تھالیوں میں بیٹھنے کی کوشش میں ہوتا۔ کبھی کبھار دھکم دھکا میں کسی کی 'پانچوں انگلیاں تھالی میں ہوتیں اور سَر لڑائی میں'۔ بڑے بچے جو عام طور پر ایسی ہنگامی افطاری میں ماہر و مشاق ہوتے، وہ اپنے لیے جگہ بنانے کی غرض سے ہمارے سَر کی ٹوپی نکال کر دُور اُچھال دیتے۔ جب تک ٹوپی لے کر ہم واپس آتے، تب تک 'خالی' جگہ 'پُر' ہو چکی ہوتی اور تھالی 'پُر' سے 'خالی' ہو چکی ہوتی۔ وہ تمام چیزیں ہر بچے کی دونوں مٹھیوں میں ہوتیں اور کچھ اُن کے پھُولے ہوئے منہ میں بھی۔ اور یہ سب تو ہم چھیننے سے رہے!

بچوں کی نوچ کھسوٹ کا وہ منظر دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آج کے بعد دنیا سے کھانا پینا اُٹھ جائے گا۔ آج موقع ہے، نیت نہیں تو کم اَز کم پیٹ ہی بھر لیا جائے۔ اُس ہنگامے میں کچھ غریب بچے ایسے بھی ہوتے تھے جو افطار کے بعد اِدھر اُدھر بکھری ہوئی، کُھلی ہوئی اشیا چُنتے اور اپنی میلی ٹوپیوں میں ڈال کر گھر لے جاتے۔ یہ سب دیکھ کر ہم جب پُر جوش پُوری کو سمجھاتے کہ جو خوشی اپنا لقمہ دوسروں کو دے کر ملتی ہے، اصل میں وہی سچی خوشی ہوتی ہے۔ وہ کہتے، ''میں ایسا ہی کرتا ہوں۔ اپنا چھوٹا لقمہ دوسروں کو دے کر خوش ہوتا ہوں اور دوسروں کا بڑا لقمہ ہتھیا کر اُنہیں بھی خوش ہونے کا موقع دیتا ہوں۔''

رمضان میں ہر بچے کو گھر سے نماز اور افطاری کے لیے تھوڑی چھوٹ ملتی، اِس خیال سے کہ بچے کا روزہ بہل جائے۔ ماں باپ یہ سوچ کر خوش ہوتے کہ ہمارا بچہ نمازی بن گیا ہے اور بچے خوشی سے مسجد میں دوڑتے پھرتے کہ اِتنی کھلی جگہ اُنھیں نہ اپنے گھر میں ملتی اور نہ پورے محلّے میں۔ مسجد

میں آ کر اُن کے ہاتھ پیر کھل جاتے ۔ بچے اِس انتظار میں ہوتے کہ بڑے نیت باندھ کر پابند ہوجائیں اور وہ...... آزاد۔ پھر بڑوں کی کیا مجال کہ اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھیں۔ جب نماز ختم ہوتی تو بڑے اُن بچوں کو ڈانٹنے سے زیادہ اُن کے والدین کو اِس ناقص تربیت پر کوستے اور اُنہیں غائبانہ مشورے بھی دیتے۔ وہ مشورے گھوم پھر کر خود اُن تک بھی پہنچتے تھے، کیوں کہ اُن کے اپنے بچے بھی اُس شرارتی ٹولے میں ہوتے، جن پر اُن کی نگاہ نہیں پڑتی تھی۔

یوں تو عام دِنوں میں مغرب کے بعد ہمارے گھر کے دروازے باہر جانے کے لیے ہم پر بند ہوجاتے، لیکن رمضان میں تراویح تک ہمیں 'دینی' چھوٹ مل جاتی۔ تراویح میں اکثر یہ ہوتا کہ سجدے میں ہماری آنکھ لگ جاتی۔ ہم یہ سوچتے کہ کاش پوری تراویح سجدے میں ہوتی! تراویح میں امام صاحب تیزی سے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد جو کچھ پڑھتے تھے، اُس میں ہمیں ہر آیت کے آخری لفظ کے علاوہ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے امام صاحب سے 'چھوٹی سی' ہمت کرکے پوچھا بھی کہ وہ اِتنی تیزی سے کیوں پڑھتے ہیں؟ تو اُن کا جواب تھا کہ منتظمین نے آدھے گھنٹے میں تراویح ختم کرنے کی پابندی رکھی ہے۔ ہم نے اپنی ہمت بڑھائی اور کہا، ''لوگوں کی سمجھ میں بھی تو کچھ آنا چاہیے۔''

''آہستہ پڑھنے پر بھی لوگوں کی سمجھ میں کیا آنے والا ہے؟ ایسا منتظمین کہتے ہیں۔ کاش! منتظمین کو کوئی سمجھائے!'' امام صاحب ہمیشہ اِسی طرح سرد آہ بھر کر اپنی بے اختیاری کا اظہار کرتے۔

رمضان کی اِتنی ساری خوشیوں کے بعد ہمیں عید کی دُہری خوشی ملتی۔ ہماری خوشی میں مزید اضافہ اُس وقت ہوجاتا، جب ہم بڑوں کو یہ کہتے سنتے کہ ''یہ تو بچوں کی عید ہے۔'' پھر ہم اُن سے خوب عیدی وصول کرکے اُن کے قول و فعل میں تضاد پیدا نہ ہونے دیتے۔ ایک مرتبہ پُرجوش پُوری نے ہماری مٹھیوں میں 'کسمساتے' نوٹ دیکھے تو اُنہیں بڑا ترس آیا (نوٹوں پر نہیں ...... ہم پر)۔ وہ بولے، ''نادِر خانُو! تم کب سُدھرو گے؟ تمہارے ہاتھ میں اِتنے سارے پیسے دیکھ کر کوئی تمھیں ایک روپیہ بھی نہیں دے گا۔ اِن پیسوں کو جلدی سے کہیں ٹھونسو...... اور ایسے بنو جیسے تمھیں کسی نے کچھ بھی نہیں دیا۔ بڑوں کو بھولنے کی بیماری ہوتی ہے، اِس سے فائدہ اُٹھاؤ! مجھے دیکھو، میں نے

تمہارے ابو سے دو...... دوبار عیدی اَینٹھی ہے۔"

پُر جوش پُوری کا رمضان اور اُن کی عید اپنی جگہ۔ ہم اُن کا ہر سبق ہَوا میں اُڑا کر، اپنی پوری شرارتوں کے ساتھ ایک نئے چاند اور ایک نئے رمضان کے تصوّر میں گُم ہو جاتے۔

(ستمبر، دو ہزار نو)

دنیا بھر کے راستے واستے

کسی بھی منزل تک پہنچنے کی اوّلین شرط ہے راستہ۔ شہروں میں راستے اِس لیے بنائے جاتے ہیں کہ وقت بے وقت کھدائی کے لیے کوئی معقول جگہ میسر ہو، اَور حادثوں کا کوئی بہانہ ہو! راستہ پار کرنا بھی ایک فن ہے۔ بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ اِس فن میں تاک ہوتے ہیں۔ یہ تو اُن کی بائیں ٹانگ کا کھیل ہوتا ہے۔

راستہ پار کرنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ راستے پر گاڑیاں ہوں۔ اور پہلی شرط یہ ہے کہ راستہ ہو! گاؤں میں راستہ رینگتے ہوئے اور لوٹ لوٹ کر بھی پار کیا جا سکتا ہے۔ گاؤں میں تو راستہ پار کرنے سے پہلے راستہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اور اگر راستہ ہو بھی تو وہ راستہ پار کرنے والوں کی راہ تکتا ہے۔ شہر میں راستہ پار کرتے وقت دائیں بائیں اور سامنے بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ سامنے اِس لیے کہ آج کل شہروں کی آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ آپ اکیلے راستہ پار نہیں کرتے۔ ایک شہرِ پریشاں آپ کے ساتھ راستہ پار کرتا ہے۔ کیا پتا کوئی اپنی دُھن میں مخالف سمت سے آکر، مسائل سے بھرے اپنے سَر سے آپ کو ٹکر مار دے۔ اگر کسی وجہ سے وہ چُوک جائے تو آپ جا کر مار دیں۔ راستہ پار کرتے وقت سامنے دیکھنے کے علاوہ اپنی 'نگاہِ بلند' نیچی رکھنا بھی ضروری ہے۔ نیچے دیکھے بغیر آگے

جانے کی کوشش میں ہوسکتا ہے آپ کو بہت نیچے جانا پڑے۔ کھلے منہ والا کوئی مین ہول آپ کو ثابت نگل جائے اور آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

کسی بھی مین ہول کا ہمہ وقت کھلا رہنا اشد ضروری ہے، تاکہ کسی آنکھ والے کی آنکھ چُوکے اور وہ اُس میں جا اُترے تو بے چارے کا دَم نہ گھٹے۔ اسی لیے کچھ خیر اندیش ایک ایک کر کے شہر کے تمام مین ہولز کے ڈھکن دن دہاڑے اُڑا لے جاتے ہیں۔ اِتنے بھیڑ بھڑ ّ گئے میں ایسے ایسے بھاری بھرکم ڈھکن اُٹھا کر گدھے کے سَر سے سینگ کی طرح غائب کر دینا کوئی شریف بچوں کا کھیل نہیں۔

ہمارے کرم فرما پُر جوش پُوری (جو Manhole کو Main-hole کہتے ہیں) کا کہنا ہے کہ اِتنی نفاست سے تراشے گئے لوہے کے قیمتی ٹکڑے کو کسی گندے نالے کے بدبُو دار منہ کا ڈھکن نہیں ہونا چاہیے۔ لوہا منوانے کی جگہیں اور بھی ہیں۔ یوں بھی اِن ڈھکنوں کی وجہ سے راہ گیر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ اِن پر پورے اعتماد کے ساتھ قدم جما کر رکھتے ہیں اور یہ اچانک پیروں کے نیچے سے زمین کی طرح نکل کر دغا دیتے ہیں۔

اِن سَر پوش کنوؤں کے علاوہ ہمارے ہاں راستوں میں چھوٹے چھوٹے تالاب بھی بنے ہوتے ہیں۔ اِن کی ابتدا معمولی گڑھوں سے ہوتی ہے۔ آگے چل کر اِن میں بارش اور نالیوں کا زائد پانی ذخیرہ ہوتا رہتا ہے۔ اِن ذخائر میں سالہا سال پانی کی کمی نہیں دیکھی جاتی۔ اِن میں سے گاڑیاں جھٹکے کھا کر گزرتی ہیں اور گاڑی چلانے والے ہر جھٹکے پر گالیوں کی تے کرتے اور لوگوں پر کیچڑ اُچھالتے ہوئے گزرتے ہیں۔ 'وہ' غسل دیتے ہیں کہ نہانے والوں پر غسل واجب ہو جاتا ہے!

ہمارے شہروں میں تو یہ راستے کچھ بے گھر لوگوں کی خواب گاہیں بھی ہوتی ہیں۔ رات گئے تک وہ انتظار کرتے ہیں کہ کب دکان والے اپنا بکھیڑا سمیٹیں اور کب اِن کا بستر خالی ہو۔ پھر جب یہ سوتے ہیں تو ہر گزرنے والی گاڑی اُن کی مفلسی پر تیز روشنی ڈالتی ہے اور اُن کے خوابوں پر سڑک پر بنے تالابوں کا پانی پھیر دیتی ہے۔

کہتے ہیں، جاپان میں ایک کے اوپر ایک راستے بنے ہوئے ہیں۔ جاپانیوں نے راستہ بنانے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ وہ دسویں منزل کے اپنے پُرتعیش فلیٹ سے نکل کر سیدھے راستے پر آسکتے ہیں۔ ہمارے دوست پُرجوش پُوری بھی کاروبار میں بھاری نقصان اُٹھانے کے بعد دسویں منزل سے راستے پر آ گئے۔

دنیا میں سب سے زیادہ پُل جاپان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہاں ہر پُل ایک نیا پُل نظر آتا ہے۔ جاپان کی ترقی میں اِن ہی پلوں کا ہاتھ ہے، جب کہ ہمارے ملک کی ترقی میں اِن پلوں کی ٹانگ ہے! یہ ایسی جگہ بنائے جاتے ہیں کہ لگتا ہے حکومت ترقی کی راہ میں ٹانگ اَڑا رہی ہے۔ جاپان کی نوے فیصد آبادی ملک کے بیس فیصد رقبے پر آباد ہے، اسی لیے جاپان کا ہر شہر بھیڑ سے لبریز ہے، لیکن کیا مجال کہ چھلک جائے۔ بھیڑ میں رہنا اور چلنا پھرنا شاید جاپانیوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھیڑ کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے وہاں سُومو پہلوان بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ اُن کی ترقی کا راز بھی اسی میں ہے کہ فاصلے کم سے کم ہوں اور وقت کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہو۔

راستوں سے ہوتے ہوئے بات جب پُل پر آ ہی گئی ہے تو آیئے کچھ پُل کی تعریفوں کے پُل باندھے جائیں۔ شہر میں جب بھی کوئی نیا پُل بنتا ہے تو ہم اُس کی عظمت کو دُور سے ہی سلام کرتے ہیں۔ پتا نہیں کب کس کروٹ بیٹھے۔ جب اچھا خاصا ٹریفک اُس پُل کی چھاتی کُوٹ کر گزر جاتا ہے تو ہم اُس پر (پھونک پھونک کر) قدم رکھتے ہیں۔ انگریزوں نے ہمارے ملک میں جو پُل بنائے تھے، وہ آج بھی پُل کا کام دے رہے ہیں، کیوں کہ اُن کے پاس لوگوں کو مارنے کے اور بھی طریقے تھے۔ یوں بھی اُن کا دَور پُل کے بنتے ہی اُسے گرانے کی 'جدید تکنیک' سے محروم تھا۔

ہم نے جب سوچ کے پُل پر ذہن کے گھوڑے دوڑائے تو گرتے پڑتے اِس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا کا پہلا پُل کسی ندی کے اوپر بنایا گیا ہوگا۔ کچھ تیرنے والے حضرات کسی طرح ندی کے اُس پار گئے ہوں گے اور اُن لوگوں نے یہ چاہا ہوگا کہ جنہیں تیرنا نہ آتا ہو، وہ بھی آ کر دیکھیں کہ

دوسرے کنارے سے اُن کا اپنا کنارا کیسا نظر آتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے ہوں کہ ہمارا اپنا کنارا پرَ لے کنارے کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت نظر آتا ہے۔آپ بالکل صحیح سوچ رہے ہیں۔اِس کام کے لیے وہ کشتی بھی تو بنا سکتے تھے۔پُل کیوں بنایا؟ خیر...... پُل سے اُتر کر دوبارہ کچھ راستوں کا بیاں ہو جائے:

یورپ اور اُمریکا میں بڑے لمبے چوڑے راستے ہوتے ہیں۔پھر بھی اُن چوڑے راستوں پر گاڑیاں کسی نہ کسی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر ٹکر مار ہی لیتی ہیں۔اِن ملکوں کے راستے تیسری دنیا والوں کے لیے آسانی سے نہیں کھلتے۔ پر یہ دنیا کے ہر ملک میں، بلکہ دل و دماغ میں بھی بآسانی راستہ بنا لیتے ہیں۔

ممبئ شہر میں راستے پر چلنا ایسا ہے جیسے قطار میں چلنا۔ایک دوسرے کے دھکّے سے ہی پورا شہر چلتا ہے۔وہاں تو گاڑیاں بھی پیدل چلتی ہیں۔وہاں کے راستوں پر چلو تو شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ممبیا زبان میں اگر کہا جائے تو 'شیانے' سے 'شیانا' چھلتا ہے۔ممبئ میں شارٹ کٹ مار کر بھی آپ وقت سے پہلے نہیں پہنچ سکتے، کیوں کہ وہاں ہر دوسرا آدمی...... تیسرے سے بڑھ کر 'شیانا' ہوتا ہے۔'بولےتو' وہاں سب کے سب شارٹ کٹ مارتے ہیں۔

چین کے راستے دنیا کے راستوں کے مقابلے میں ذرا چَین کا سانس لیتے ہیں۔اُن پر گاڑیوں کے اِتنے ظلم نہیں ڈھائے جاتے۔ایک کار کی جگہ چار چار، پانچ پانچ سائیکلیں چلتی ہیں۔ چین والوں نے دشمنوں کے راستے میں لمبی چوڑی دیوار کھڑی کی اور اَب اُسی کو راستہ بنا دیا۔چین کے نقشے میں بھی دیوارِ چین کے نقش کسی راستے سے کم نظر نہیں آتے۔شاید آپ کو علم نہ ہو کہ چین کے تمام راستے 'میڈ اِن چائنا' ہیں۔چین پر ہماری باتیں سُن کر پُر جوش پُوری چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں،''یار! تم بڑے نکتہ چیں ہو، ہمیشہ چین کے پیچھے پڑے رہتے ہو''۔ہمارا جواب ہوتا ہے''ظاہر ہے، جب چین اِتنا آگے نکل رہا ہے تو... ہم پیچھے ہی 'پڑے' رہیں گے نا!''

پُوری نہیں جانتے کہ ہم چین کے بارے میں کیا کچھ علم رکھتے ہیں،ہم تو اُس پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں،جس کا نام ہوگا...... 'محبت اور بیجنگ میں سب جائز ہے۔'

قاہرہ میں تو راستے نظر ہی نہیں آتے۔ راستوں پر گاڑیاں اور انسانی سَر بچھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قاہرہ میں لوگ راستہ پار نہیں کرتے، بلکہ گاڑیاں لوگوں کو پار کرتی ہیں۔ کسی مصری سے راستہ پوچھنا، راستے سے بھٹکنے کے مترادف ہے۔ اگر اُسے راستہ پتا نہ بھی ہو تو وہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لے گا۔ ایک مصری، کسی دوسرے مصری پر بھروسا نہیں کرتا۔ وہ دوسرے مصری سے راستہ پوچھ کر آگے بڑھتا ہے اور فوراً ہی کسی تیسرے مصری سے اُس کی تصدیق کرتا ہے۔ یعنی پہلا مصری، دوسرے مصری پر بھروسا نہیں کرتا، بلکہ تیسرے مصری پر بھروسا کرتا ہے۔ پہلا مصری، دوسرا، تیسرا ...... اُوووف! ہم تو اُلجھ گئے۔

کسی بنگلا دیشی سے راستہ پوچھنے کا تجربہ کسی امتحان سے کم نہیں ہوتا۔ اگر آپ اُس سے راستہ پوچھیں تو گول مول لہجے میں اُس کا سب سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ اُس کے بعد سوالات کا ایسا سلسلہ شروع ہوگا کہ آپ کہیں گے،'' اُوووف! جنتِ بنگال! میں تو بھول ہی گیا، مجھے جانا کہاں ہے۔'' بنگلا دیش کے راستوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُن میں کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ اور جب کشتیاں نہ چل رہی ہوں، تب اُن راستوں پر دو سیاسی پارٹیوں میں آئے دن 'کشتیاں' چلتی ہیں۔ 'کشتیاں' اگر نہ ہوں تو 'کشتیاں' چلنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ہمارے ہاں کچھ راستوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اُنھیں کیا سمجھا جائے! دنیا بھر کے کام اِن ہی راستوں پر ہوتے ہیں۔ کاریں اور بسیں چلتی ہیں۔ بڑے بڑے ٹرک خراٹے مار کر گزرتے ہیں۔ اِن کے بیچ میں جو خلا بنتا ہے، اُن میں سے آٹو رکشا اور ٹیکسیاں سمٹ سمٹ کر گزرتی ہیں۔ موٹر سائیکل کے کرتب باز، دائیں بائیں، آڑے ترچھے ہو کر اپنی دانست میں اُڑے اُڑے جاتے ہیں۔ ہاتھ گاڑیاں اور ٹھیلے بھی جدید سواریوں کی رفتار سے رفتار ملا کر چلتے ہیں اور اِن سب کے بیچ پس پس کر چلتا ہے پیدل انسان۔

اِن سب کے علاوہ اِن راستوں پر جلوس بھی نکلتے ہیں۔ سیاست داں اِن ہی راستوں پر تتر بتر بھیڑ اکٹھا کر کے طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔ اِن ہی راستوں پر گھوڑی پر سوار دولہے کی 'آخری بارات' بھی نکلتی ہے (آخری بارات اس لیے کہ بعد میں اُس کی عقل

ٹھکانے آجاتی ہے، یعنی عقل گھوڑی سے بڑی ہو جاتی ہے)۔ اِتنی کھلبلی میں کچھ لوگ اِن راستوں پر اکیلے میں بھی ملتے ہیں۔ اور تعجب ہے کہ اِتنا کچھ ہونے کے باوجود لوگوں کو تھوکنے اور کوڑے کے ڈھیر لگانے کی بھی جگہ مل جاتی ہے۔ اور تو اور، کتے بلیاں اور کچھ مخصوص قسم کے جانور دُم ہلا ہلا کر اپنے حال اور مستقبل سے بے پروا اپنی تمام عمر اِن ہی راستوں پر گزار دیتے ہیں۔

ہمارے کلون پلانر (Clone Planner) کا کہنا ہے، "راستے انسانی زندگی پر اَثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی اپنے کام کے اَوقات میں اتنا نہیں تھکتا، جتنا اِن راستوں پر آمد و رفت میں تھک جاتا ہے، جس کا اثر اُس کی نفسیات اور گھریلو زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ راستوں کے مسائل اگر وقت پر نہ حل کیے جائیں تو یہ مزید پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔"

پلانر کا کہنا بالکل درست ہے، مگر بہتری اُس صورت میں ممکن ہوگی جب سسٹم میں تبدیلی آئے گی۔ چاہے ہم اور آپ بھی اقتدار میں آجائیں، تب بھی کچھ نہیں بدلے گا۔ ہم بڑی بڑی باتیں کرنے والے بھی سسٹم کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ سب کچھ بدلنے کا عزم رکھنے والے جب خود ہی بدل جائیں تو پھر تبدیلی صرف خوابوں میں ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ اور خواب ہی ایک عام آدمی کو اِن حالات میں زندہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ہماری بات تو ختم ہوئی، مگر...... راستے ختم نہ ہوئے...... اور کوئی راستہ بھی سُجھائی نہ دیا۔

(جولائی، دو ہزار سات)

اُونٹ پہاڑے کے نیچے

دو......اکم دو، دو دُونی چار، دو تیا چھ، دو چوک......کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں (یوں بھی میں کبھی کبھی ہی سوچتا ہوں) کہ ہمیں یہ پہاڑے کیوں رٹائے جاتے ہیں؟ پہاڑوں کا دوسرا نام ذہنی ضرب ہے، یعنی چیخ چیخ کر 'فرشِ محلّہ' ہلانا اور ذہن پر ضرب لگانا، جس کا حاصلِ ضرب = کچھ بھی نہیں۔

صبح صبح اسکول پہنچتے ہی آنکھ، کان اور دماغ کا کھلنا ضروری ہوتا ہے، اسی لیے شاید بچوں سے کھوپڑی چٹخانے والی آواز میں پہاڑے پڑھوائے جاتے ہیں۔ روز روز کی رٹائی سے بچے اِتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ 'چار نوا چھتیس' اور 'نو چوک چھتیس' میں کوئی فرق ہی نہیں سمجھتے۔ رٹائی کی اِس کثرت اور کسرت سے اسکول کے آس پاس کے لوگ پہاڑ جیسے دن کا سامنا کرنے سے پہلے پہاڑوں کے مخصوص راگ......'راگ پہاڑی' کا اچھی طرح ریاض کر لیتے ہیں۔

پہاڑوں اور گنتی کا اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو گنتی کی حیثیت پہاڑے کے سامنے ایسی ہے جیسے ...... پہاڑ کے آگے رائی۔ گنتی ہے رینگتا ہوا کچھوا اور پہاڑے ہیں چوکڑیاں بھرتے ہرن~~~~~.

بچپن میں مجھے پہاڑوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ اِس لیے کہ اِن میں ڈاکو چھپے رہتے ہیں۔ پہاڑوں سے پچاس پچاس کوس دُور شام گڑھ میں جب کوئی بچہ روتا ہے تو ماں کہتی ہے، ''بیٹا سو جا! نہیں تو پہاڑوں سے گبّر آ جائے گا۔ وہ دس مارے گا، ایک گِنے گا۔ بیس مارے گا، دو گِنے گا۔ اور جو وہ مارے گا ناں! سب کی سب گولیاں ہوں گی۔ وہ پہاڑے نہیں رٹتا۔ پہاڑوں سے آتے ہی پہاڑ ڈھاتا ہے۔''

اب تو پہاڑوں میں گنتی کے ہی ڈاکو رہ گئے ہیں۔ گئے وہ دن جب 'جنابِ گبّر' پہاڑوں میں خلیل خان والی فاختائیں اُڑایا کرتے تھے۔ اب تو یہ سب 'قصّۂ پہاڑینہ' ہو چکے۔ لیکن پہاڑ جیسا دِکھنے والا امریکا کہتا ہے کہ اِن پہاڑوں میں دہشت گرد چُھپے ہوئے ہیں، مگر اُسے ٹھیک ٹھیک نہیں پتا کہ کن کن پہاڑوں میں۔

میں بات کر رہا تھا بچپن کی۔ بچپن میں جب مَیں بڑا ہوا تو پہاڑوں کا ڈر بھی نکل گیا۔ آپ کو یقین ہو نہ ہو، میں دو سے دَس تک کے پہاڑوں سے آنکھیں موند کر نکر لیتا تھا۔ لیکن اِس سے آگے، گیارہ، بارہ، تیرہ کے اُونچے اُونچے پہاڑوں کی ڈانک مجھ سے کاٹی نہیں جاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر میری حالت فرہاد سے بھی بدتر ہو جاتی تھی۔ فرہاد کے ہاتھ میں تو ایک عدد تیشہ بھی تھا۔ اور بدلے میں اُسے شیریں بھی ملنے والی تھی۔ میں نے بچپن میں یہی سُنا تھا کہ شیریں کو فرہاد نے پہاڑوں کو کاٹ کر ہی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے دوست پُر جوش پُوری کہتے ہیں، ''بڑی بات نہیں کرتا، بچپن میں میرے سامنے بھی ایسی ہی پیشکش رکھی جاتی تھی۔ میرے ایک دُور کے چچا اکثر کہتے، ''بیٹا! پہاڑے سناؤ! تمہیں شیرینی ملے گی۔'' گردشِ ایام نے آج مجھے اُن کا داماد بنا دیا ہے۔ قسم پہاڑوں کی، میں اِتنا بے وقوف آج تک نہیں بنا۔ سب جوڑیاں آسمانوں میں بنتی ہیں، میرا جوڑ پہاڑوں میں بنا۔''

چلیں پھر بات کرتے ہیں بچپن کی، پہاڑوں کی۔ وہ پہاڑوں کے دن بھی کیا دن تھے۔ اُن دِنوں میرا ایک ہم جماعت تھا، جو پہاڑوں کا طوطا تھا اور پہاڑے کی چوٹی پر تھا۔ پہاڑے اُس کے لیے ایسے تھے، جیسے رُوئی کے پہاڑ۔ ظالم دُھنک کر رکھ دیتا تھا۔ میں اکثر اپنی کمزوری چھپانے کے

لیے اُس کے بغل میں کھڑا ہو جایا کرتا تھا اور اُس کے سُر میں سُر ملاتا تھا۔ پھر ہوتا یوں کہ وہ گلوکار اور میں موسیقار~~~ کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا کہ میں موسیقی میں اتنا مگن ہو جاتا تھا کہ گلوکاری تھم جاتی تھی، مگر میرا راگ نہ تھمتا تھا۔ اُس کے بعد تو مجھ پر پہاڑ ٹوٹتا تھا۔ پہاڑ جیسے استاد کو یہ سمجھتے دیر نہ لگتی تھی کہ یہ پہاڑے، ریت کے پہاڑوں جیسے ہیں۔ پھر کیا ہوتا؟ مت پوچھیے! سزا کے طور پر اُستاد مجھے سوا، ڈیڑھ، پونے دو اور ڈھائی کے پہاڑے پڑھواتے تھے۔ ڈھائی ایکم ڈھائی، ڈھائی دُونی پانچ، ڈھائی تیا ساڑھے سات۔ اب بتائیں! مجھ سے سیدھے سیدھے پہاڑے نہیں پڑھے جاتے تھے، یہ گھوڑے کی چال والے پہاڑے کیا پڑھتا۔ سچ کہتا ہوں، میں تو ایسا اُونٹ ہوں جو کبھی پہاڑے کے نیچے آیا ہی نہیں۔

پہاڑے...... اصل زندگی میں ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ اِن پہاڑوں میں تو بڑے بڑے خزانے پوشیدہ ہیں۔ دو...... ایکم دو، دو دُونی چار، دو تیا چھ، دو چوک آٹھ۔ اسی طرح چھلانگ لگتی ہے۔ اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں، یہ چھلانگ~~~ اور بھی لمبی ہوتی جاتی ہے۔ گنتی کو چھوڑ کر پہاڑوں کے اُصول پر عمل کر کے ہم چھوٹی چھوٹی کوششوں کو چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے ضرب دے کر بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ بس ذرا پہاڑوں کی رٹائی چھوڑ کر چڑھائی شروع کرنا ہوگی اور اُونٹ کو پہاڑ کے اوپر لانا ہوگا۔

(اکتوبر، دو ہزار چھ)

پَیسا...... ہے ہی اَیسا

آج پیسے پر کچھ بولنے کو جی للچا رہا ہے۔ میں پیسے پر کیا بول سکتا ہوں کہ پیسا خود بولتا ہے۔ پیسا کچھ لوگوں پر نظر آتا ہے تو کچھ لوگ پیسے کو اَپنے اوپر نظر آنے دیتے ہیں۔ کچھ لوگ جان بوجھ کر ایسے نظر آتے ہیں کہ اُن کے پاس کوئی پَیسا وَیسا نہیں ہے، تاکہ کہیں سے چار پیسے مل جائیں۔ یوں بھی ایسے لوگوں کی حالت دیکھ کر پیسا، دو پیسا دینے کو جی کرتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پیسا ہاتھ کا مَیل ہوتا ہے جو ہاتھ سے ہو کر نیت میں آجاتا ہے، پھر دل میں اور رشتوں میں، لیکن ہاتھ کا یہ مَیل دھویا نہیں جاتا۔ بھلا کوئی پیسے سے ہاتھ دھو بیٹھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اِسی لیے کچھ لوگوں کے پاس یہ مَیل اِس حد تک جمع ہو جاتا ہے کہ 'مَیل کا پتھر' بن جاتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا سے تو سکندر کی طرح جاتے ہیں، مگر زندگی سکندری نہیں جیتے۔

پیسا کئی امراض کا سبب بن سکتا ہے۔ کچھ کو قرض لینے کا مرض ایسا لاحق ہو جاتا ہے کہ مرتے دَم تک نہیں چھوٹتا۔ تو کچھ کو قرض دے کر بلاوجہ کا روگ مل جاتا ہے، جس کا علاج مقروض کے پاس ہی ہوتا ہے، لیکن وہ یہ نسخہ بڑی مشکل سے اپنے بیمار کو دیتا ہے۔ وہ اُس نسخے کو لیے اُڑا اُڑا پھرتا ہے۔ اکثر اُس قرض میں ایسی جادوئی تاثیر ہوتی ہے کہ بندہ ہی غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار قرض

کی رقم نکالنا، جان نکالنے سے بھی زیادہ دُشوار ہوجاتا ہے۔سو...... کچھ لوگ قرض کی رقم نکالنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ وہ مقروض کی جان نکال لیتے ہیں۔ پھر بھی:

حق تو یہ ہے کہ 'قرض' ادا نہ ہوا

میرے دوست پُر جوش پُوری کہتے ہیں، ''اگر میرے پاس اِتنا پیسا آجائے کہ میں دنیا کا دولت مندترین آدمی بن جاؤں تو سب سے پہلے وہ پیسے گِننے بیٹھ جاؤں گا، تاکہ ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوسکے کہ مجھے اب اور کتنے پیسے کمانے ہیں۔'' اِس پر میرے کلون پلانر (Clone Planner) نے اُنہیں سمجھایا کہ جب تم پیسے گننے بیٹھ جاؤ گے تو اتنی دیر میں تمہارے پیسے منجمد (Freeze) ہوجائیں گے۔ پھر کوئی دوسرا تم سے آگے نکل جائے گا۔ اگر تمہیں پہلی پوزیشن پر رہنا ہے تو اُس پیسے کو چلتا رکھنا ہوگا، یعنی ایک پیسا تمہارے ہاتھ سے کسی دوسرے کے ہاتھ میں جائے اور دو پیسے بن کر تمہارے پاس واپس آئے۔ پُوری صاحب! پیسا پھینکو، پیسا کھینچو!''

پیسا جتنا بھی کمایا جائے، کم ہے۔ اگر سو رُوپے کا چیک لکھا جاتا ہے تو اُس کے آگے 'اونلی' (Only) لکھا جاتا ہے۔ اور ایک کروڑ کے آگے بھی 'اونلی'۔ بعض لوگوں کا مقصدِ حیات 'پیسا اونلی' ہوتا ہے۔ ایسے لوگ یہ اُصول بھول جاتے ہیں کہ جیسے پیسا کسی ذریعے سے اُن کے پاس آیا ہے اسی طرح اُس میں سے کچھ حصہ کسی اور کے پاس بھی منتقل ہونا چاہیے۔ پیسا ہاتھ کا مَیل ہوتا ہے اور مَیل ہاتھ سے چھڑانا ضروری ہے۔

جب ہمارے پاس کسی وَسیلے سے پیسا آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارے نصیب سے آیا ہے۔ لیکن جب کسی کو اُس کا حق دینے کی باری آتی ہے تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اُس کا بھی تو نصیب ہے!

...... پیسے پر جتنا بھی لکھا جائے، کم ہے!

(اپریل، دو ہزار دَس)

ہر جُوتے کے دِن پھرتے ہیں

(پہلے یاد کیجیے، سابق امریکی صدر بش کی پریس کانفرنس۔ پھر عراقی صحافی:
منتظر الزیدی اور اُس کا دس نمبر کا جُوتا۔ اب آگے پڑھیے)

ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جوتوں پر کچھ لکھیں گے۔ اور بے حمیّت سیاست دانوں کو پڑنے کے بعد تو جوتے اِس قابل ہی نہیں رہے کہ اُن پر کچھ لکھا جائے۔ لیکن جب ہم نے بُش کو جوتے پڑنے کے بعد سب قلم کاروں کی جوتوں پر لکھنے کی اِشتہا دیکھی تو ہمارے پیٹ میں بھی جُوتے دوڑنے لگے۔ چار و ناچار ہمیں بھی جوتوں کی شان میں قصیدہ گوئی کا قصد کرنا پڑا۔ یوں تو اَب سے پہلے بھی بے شمار سیاست دانوں کی شہرت میں جوتوں سے چار چاند (کے دھبّے) لگے ہیں، لیکن بُش پر ہوئی جوتوں کی غُلّہ باری (نشانہ بازی) کو میڈیا اور اَدبی حلقوں نے عراق پر ہوئی گولہ باری سے زیادہ اُچھالا۔ لیکن اُس کی ڈھٹائی دیکھیے کہ:

جُوتیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ ایک صحافی نے کسی کی 'جوتے سے خبر لی ہو'۔ اُس صحافی نے سابق امریکی صدر بُش پر جوتے اُچھال کر، شعرا اور اُدبا کی طرف ایک نیا موضوع اُچھال دیا۔ پھر سب

نے جوتوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُس کے بعد سَر پر اُٹھا لیا۔ جہاں دیکھو جہاں جوتے اُڑائے جا رہے ہیں۔ اب تو حال یہ ہے کہ جوتوں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ ہر قلم کار ہاتھ کا کام طاق پر رکھ کر جوتوں کے پیچھے ہاتھ پاؤں دھو کر پڑ گیا ہے۔ اپنی دانست میں سب لکھنے والے کاغذ پر جوتے چلا کر ایسے خوش ہیں، گویا اُنہوں نے ہی بُش پر جوتے چلائے ہوں۔ اُن کی خوشی عراقی صحافی سے بھی کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اُس صحافی کو تو اپنے چرمی جوتوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور امریکی فوج کی گرفت میں آ کر اپنی کھال سے بھی، جب کہ شعرا اور اُدبا جوتے چلا چلا کر داد بٹور رہے ہیں اور اپنی کھال میں پھُولے نہیں سمار ہے۔

بات اُس پریس کانفرنس کی نکلی تو ہم نے اپنے ہمدمِ دیرینہ پُرجوش پُوری سے کہا، ''ہم اگر اُس صحافی کے جوتوں میں ہوتے **(If I were in his shoes)** تو ملٹری شُوز **(Military shoes)** میں ہوتے، جس کے نیچے موٹی سی گھوڑے کی نعل بندھی ہوتی۔ اور پھر......''

''ملٹری شُوز کی بات کرتے ہو!'' پُرجوش پُوری نے ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا، ''پہلے وہ جوتا تم سے اُٹھ پاتا، تب نا چلا پاتے! ہم اگر اُس کی جگہ ہوتے'' پُوری نے (جو سب کو اپنی جُوتی اور مُونچھوں کی نوک پر مارتے ہیں) اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ''ہم اُس کی جگہ ہوتے تو ایک منصوبے کے تحت جوتوں کی بوری لے جاتے اور اُنہیں دونوں ہاتھوں سے لُٹاتے اور سب فتنہ گروں کو یہ دِکھا دیتے کہ ہم جوتے بیچ کر سو نہیں رہے ہیں۔''

جوتے کی تو اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، لیکن اِس کے پہننے سے...... پہننے والے کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ کبھی کبھار شخصیت کے سبب جوتے کی قیمت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ایسا دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔ یعنی جوتا پیر میں ہو تب بھی اور سَر پر ہو تب بھی۔ کہتے ہیں کہ کسی کی اوقات دیکھنا ہو تو اُس کے جوتے دیکھو اور کسی کو اُس کی اوقات دکھانا ہو تو...... اُس کو جوتا دکھاؤ!

جوتے دیکھنے اور دِکھانے سے پُرجوش پُوری سے جُڑی ایک بات یاد آ گئی، وہ کہتے ہیں، ''جوتوں کی اہمیت کا اندازہ ہمیں اپنی شادی کے موقع پر ہوا، جب ہم پہلی مرتبہ 'بَن ٹھن' کر سُسرال گئے تھے۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ سُسر ال والوں کی نظر ہمارے جامے اور سَراپے سے

زیادہ ہمارے جوتوں پر تھی۔ اُس وقت ہمیں اپنی اور جوتوں کی اوقات کا فرق صاف نظر آیا۔ ہمارے احباب کو بھی ہم سے زیادہ ہمارے جوتوں کے 'ہاتھ' سے نکل جانے کی فکر تھی۔ بقول اُن کے ہم تو شادی کے بعد ہاتھ سے نکل ہی گئے تھے۔"

ہم نے اور پُر جوش پُوری نے جب ایک نئی جہت میں سوچنا شروع کیا تو ہم پر یہ آشکار ہوا کہ ہر آدمی کو جوتے چلانے کی مشق کرنی چاہیے۔ نہ معلوم کب ضرورت پڑ جائے اور ناتجربہ کاری کے سبب نشانہ چُوک جائے۔ اِس کے لیے ہم نے یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا کہ آپ اپنی 'فراغت کی مصروفیت' میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اپنے گھر کی دیوار پر اپنے علاقے کے کسی ناکارہ سیاسی لیڈر کی تصویر چسپاں کر دیں۔ پھر ایک فاصلے پر چند پرانے اور کٹے پھٹے جوتے لے کر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اپنے ہدف پر نشانہ سادھنے سے پہلے وہ تمام مسائل، جن سے آپ دوچار ہیں، ذہن میں دُہرائیں۔ مثلاً، مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، خستہ حال سڑکیں۔ ایک لمبی فہرست ہے جو یقیناً آپ کو ازبر ہوگی۔ جتنا زیادہ کرب ہوگا اور جتنا شدید غصہ ہوگا، جوتا مارنے میں اُتنا ہی لطف آئے گا، اُتنی ہی راحت ملے گی۔ لیکن غصہ ایک حد تک قابو میں ہونا چاہیے ورنہ نشانہ خطا بھی ہو سکتا ہے۔ یاد رَہے کہ جوتا چلاتے وقت تصویر میں موجود وہ سیاسی لیڈر معصوم بن کر آپ کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور نہ کر دے۔ جذبات کو قابو میں رکھیے، ورنہ آپ اُن جوتوں سے اپنا ہی سر پیٹ لیں گے۔

ہماری اِن باتوں کا جب ہمارے کلون پلانر (Clone Planner) کو علم ہوا تو وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو گئے اور کہا، "کیا ہوگا اِن سب باتوں سے؟ بہت خوش ہیں آپ ایک طاقتور ملک کے صدر پر جوتے اُچھال کر۔ فلسطینی گزشتہ نصف صدی سے اسرائیلی فوجیوں اور ٹینکروں پر پتھر اُچھال رہے ہیں۔ کیا اب اپنے گھر میں بے گھر عراقی باشندے قابض افواج کو جوتوں سے جواب دیں گے؟ کیا ایسے بے اثر ردِّ عمل سے مسائل کا حل نکل آئے گا؟ وہ جس نے جوتے چلائے...... ذرا خود کو اُس کی جگہ رکھ کر سوچیے۔ بحیثیت عراقی اور ایک صحافی اُس کی آنکھوں نے کیسے کیسے دل دہلا دینے والے مناظر دیکھے ہوں گے۔ سہمی ہوئی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے مستقبل دیکھے ہوں

گے۔ سنگ دل فوج کے جوتوں کی ٹھوکر میں اپنوں کے سَر دیکھے ہوں گے۔ اپنے ہم وطنوں کے بے جس وحرکت جسموں پر ظلم کی تحریریں پڑھی ہوں گی۔ جانے کتنے جنازوں کو خون کے غسل کے بعد خون کے ہی کفن میں دفناتے دیکھا ہوگا۔ معصوموں کی آہ و بکا سنی ہوگی۔ موت کی نیند سورَہے بچوں کو جھنجھوڑ کر جگاتی، روتی بلکتی مائیں دیکھی ہوں گی۔ عصمتوں کے پردے چاک ہوتے دیکھے ہوں گے۔ گھٹنوں میں سر دِیے، گزرے ہوئے لمحوں کو کوستی، زندگی کی قید سے آزاد ہونے کو تڑپتی، کچھ نوچی گئی زندہ لاشیں دیکھی ہوں گی۔

یقیناً وہ جوتے چلا کر خوش نہیں ہوا ہوگا۔ وہ ہزار جوتے چلا کر بھی خوش نہ ہوتا۔ پورا عراق مل کر بھی جوتے چلا لے، تب بھی کچھ نہیں بدلے گا۔ پریس کانفرنس میں جوتے پھینکے جانے کے واقعے کی تہ میں اُس کڑوے سچ کو نہ دبایئے، ورنہ ہمارے مسائل پر 'خوش فہمی' اور 'بے حسی' کے خول چڑھتے جائیں گے اور ہم اپنی بے بسی کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے۔ جوتے چلا کر بھی نہیں۔ اپنے سر پیٹ کر بھی نہیں۔''

(جنوری، دو ہزار نو)

کینگرو کی ماں کب تک خیر منائے گی!

یاد کیجیے...... ویسٹ انڈیز میں منعقدہ کرکٹ ورلڈ کپ 2007ء، جہاں فائنل میں آسٹریلیا نے سری لنکا کو ہرایا تھا، جب کہ بھارت اور پاکستان پہلے ہی راؤنڈ میں مقابلے سے باہر ہو گئے تھے۔ بھارت کو بنگلا دیش نے اور پاکستان کو آئرلینڈ نے مات دی تھی۔اب آگے پڑھیے۔

آخر آسٹریلیا نے ورلڈ کپ 2007ء بھی جیت لیا۔ یا یوں کہا جائے کہ آسٹریلیا ورلڈ کپ شروع ہوتے ہی جیت گیا تھا۔اب بتائیں! اِس آسٹریلیا کا کیا کِیا جائے؟ آسٹریلیا تو جیسے کرکٹ کو 'کھیل' سمجھتا ہے۔اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کی تمام ٹیموں کو سَر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور ہماری طرح سوچنا ہوگا کہ اِس آسٹریلیا کا کیا کِیا جائے؟ اب کی بار تو آسٹریلیا نے ویسٹ انڈیز کے جزائر میں ......یعنی جزائر غرب الہند میں لنکا ڈھا دی۔ آسٹریلیا کبھی لنکا ڈھاتا ہے تو کبھی برطانیہ کا سورج غروب کر دکھاتا ہے۔گویا آسٹریلیا......آسٹریلیا نہ ہوا، کرکٹ کا امریکا ہوا!

آسٹریلیا سے جیتنے کی تو کوئی ترکیب نہیں نکلتی۔ ہاں! ہار سے بچنے کے دو راستے ہیں۔ایک یہ کہ اُس کے ساتھ کوئی میچ ہی نہ کھیلا جائے۔ دوسرے یہ کہ میچ شروع ہوتے ہی آسٹریلیا کی جیت

کی امکانی اُمید پر پانی پھر جائے، یعنی بارش ہو جائے۔ ہمارے دوست پُر جوش پُوری کے خیال میں آسٹریلیا کی طرح آسٹریلیا کا نام بھی قابو نہیں آتا۔ وہ 'آسٹریلیا' کو بمشکل 'اُسٹے لیا' کہہ پاتے ہیں۔ پُر جوش پُوری کہتے ہیں، ''اُسٹے لیا کو جو ہے نا! دس، بارہ کپ پیشگی دے دیے جائیں اور اُس سے کہا جائے کہ جاؤ! اب دَم لے لو! اسی کے ساتھ اُن کپس پر سنہ بھی لکھ دیے جائیں۔ مثلاً، 2011ء، 2015ء، 2019ء اور تاکید کی جائے کہ آج کے بعد ورلڈ کپ کے آس پاس بھی نہ پھٹکنا۔ بچے ڈرتے ہیں۔''

آسٹریلیا کو اگر ورلڈ کپ سے روکنا ہو تو مخالف ٹیم کو بائیس کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دی جائے، یعنی پوری 'بائیسی تُوٹے'*۔ گیارہ کھلاڑی میدان میں ہوں اور باقی گیارہ تماشائیوں میں جگہ جگہ چھپے ہوں، جنہیں میدان سے باہر کیچ پکڑنے کی اجازت ہو۔ آسٹریلیا کی مقابل ٹیم جب گیند بازی کرے تو تین کی بجائے چھ اسٹمپز Stumps نصب ہوں۔ آسٹریلیائی بلّے بازوں کے ہاتھ میں بلّے کی جگہ ہاکی اِسٹک ہو۔ اور تو اور، دونوں امپائرز کو بھی آسٹریلیا کی مخالف ٹیم کے ارکان میں شمار کیا جائے۔

بات آسٹریلیا کی ہو......اور کینگروز کا تذکرہ نہ ہو، یہ بالکل ایسے ہے جیسے کینگروز کا تذکرہ ہو......اور آسٹریلیا کی بات نہ ہو۔ آسٹریلیا میں کینگروز کی تقریباً ساٹھ قسمیں آباد ہیں، جن کی تعداد پانچ کروڑ سے بھی زائد ہے (یقین نہ آتا ہو تو خود جا کر گن لیں)۔ جب کہ انسانوں کی آبادی صرف دو کروڑ ہے۔ یعنی آسٹریلین...... کینگروز کے ملک میں بستے ہیں۔ تعجب ہے اور افسوس بھی، کہ اکثریت میں ہونے کہ باوجود کینگروز کا ایک بھی نمائندہ آسٹریلیائی ٹیم میں شامل نہیں!

کینگروز کی طرح اُن کی آبادی بھی یوماً فیوماً چھلانگ لگا رہی ہے۔ یہ بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے، یعنی آسٹریلیائی حکومت اب تین طرح کی مصیبتوں کی شکار ہے۔

پہلی مصیبت، آسٹریلیا کے وسیع اور گھنے جنگلات میں اچانک لگنے والی آگ۔ دوسری یہ کہ انسانوں کی آبادی لاکھ کوششوں کے باوجود نہیں بڑھ رہی۔ وہاں اِنسان گھر کو ویرانہ بنا رہا ہے، جب کہ کینگروز بے فکری سے جنگلوں کو آباد کر رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ افراد کو اُن کے شکار کی آزادی ہے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے ہمارے یہاں انسانوں کے شکار کی۔ یوں تو کینگروز کو ختم کرنا

اِتنا آسان نہیں، کیوں کہ یہ تو وہ ہیں کہ:

اِدھر گودے اُدھر نکلے، اُدھر گودے اِدھر نکلے

چلیں! ہم یہاں کم اَزکم اُن کا قصہ تمام کرتے ہیں۔

بعض اوقات پُر جوش پُوری بڑے عجیب وغریب سوالات پوچھتے ہیں اور دوسروں کو اُلجھا دیتے ہیں۔ اُن کا یہ سوال دیکھیں!

''ہر کینگرو کے پیٹ سے ایک بچہ چمٹا ہوا رہتا ہے، یعنی ہر کینگرو، مادہ کینگرو ہوتی ہے۔ جب ہر کینگرو مادہ کینگرو ہوتی ہے تو پھر وہ بچہ...... اُن کی جھولی میں کون ڈالتا ہے؟'' خیر چھوڑیں ...... اِن کی باتوں میں نہ اُلجھیں! ممتا کی بہترین مثال دیکھیں کہ پیٹ کا بچہ پیٹ سے الگ نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں کہ ایک اچھا کھلاڑی اچھا...... کوچ...... نہیں ہوسکتا۔ اور ایک اچھا...... کوچ...... بننے کے لیے اچھا کھلاڑی ہونا ضروری نہیں۔ اِس قول سے ہماری...... سوچ...... کو تقویت ملی کہ ہم بھی ایک اچھے...... کوچ...... بن سکتے ہیں۔ لیکن جب پاکستان کے...... کوچ...... باب وُلمر مشکوک حالت میں اِس دنیا سے...... گوچ...... کر گئے، تو ہمارے ذہن سے...... کوچ...... بننے کی ...... سوچ...... ہمیشہ ہمیش کے لیے...... گوچ...... کر گئی۔

اپنے کھیل کے دنوں میں ہم کرکٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں کھیلتے تھے۔ ہاں! کرکٹ سے کچھ وقت بچا کر تھوڑا بہت پڑھائی کا کھیل بھی کرتے تھے۔ ہر میچ میں ہمارا کپتان ہمیں سب سے مشکل جگہ پر فیلڈنگ پر مامور کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتا، ''میں تجھے سبق سکھانا چاہتا ہوں۔'' ہم یہ سوچ کر خوش ہوتے کہ ''چلو اچھا ہے، کرکٹ کا کوئی سبق ہوگا۔'' وہ ہمیں سِلی پوئنٹ (Silly-point) پر بَلّے باز کے رُوبرو کرتا۔ ایک مرتبہ بَلّے باز نے آف اسٹمپ سے باہر جاتی ہوئی شارٹ پچ گیند کو سبق سکھانے کی کوشش میں بَلّا گھمایا، اُس کی چیپٹ میں گیند تو نہ آئی، البتہ ہمارا گیند جیسا سر ضرور آ گیا۔ پھر تو سارا جہان ہمارے سامنے گھومنے لگا۔ اسکول میں استاد کے پڑھائے ہوئے سبق پر ہمیں پختہ یقین ہونے لگا کہ زمین گردش کرتی ہے۔ ہمیں چکراتا دیکھ کر ٹیم کا کپتان، اپنے سبق اور

ہمارے سر میں آخری کیل ٹھوکنے اپنی انگلیوں پر ہمیں گنتی پڑھانے آ گیا۔ "یہ انگلیاں کتنی ہیں؟ ...... یہ؟ ......اور...... یہ؟" ہم نے کہا، "پہلے یہ تو گن لوں کہ تم کتنے ہو، بعد میں یہ بتاؤں گا کہ انگلیاں کتنی ہیں۔" اُس دن کے بعد سے ہم نے سوچ لیا کہ اب یہاں وہاں سبق نہیں سیکھیں گے۔ جہاں سیکھنا ہو، وہیں سیکھیں گے۔

سبق سیکھنے سے یاد آیا کہ ہم نے اور ہمارے دوست پُر جوش پُوری نے آسٹریلیا کو سبق سکھانے کے لیے ہر آڑے ترچھے زاویے سے سوچا۔ ایک ترچھے زاویے کے مطابق یہ طے ہوا کہ ہند، پاک اور بنگلا دیش کے ٹوٹے ہوئے زاویوں کا ایک مثلث بنا کر آسٹریلیا کو گھیرا جائے اور اُسے تینوں خانے چت کیا جائے، لیکن اِن تینوں کو ملا کر بھی برِصغیر بنتا ہے، یعنی اب بھی مقابلہ برابری کا نہ ہوا۔ برِصغیر کا مقابلہ برِ اعظم کے ساتھ؟ بر......اَع ظَم...... کے ساتھ؟......ہا۔

تمام زاویوں سے سوچنے کے بعد ہمیں آسٹریلیا کو ورلڈ کپ اُچک لے جانے سے روکنے کی ایک ہی صورت نظر آئی۔ وہ یہ کہ آسٹریلیا؛ فائنل میں اپنے کسی کالج کی ٹیم کو میدان میں اُتارے۔ لیکن آسٹریلیا سے فائنل میں کھیلنے کی نوبت تب آئے گی جب ہم بنگلا دیش اور آئرلینڈ کو ہرا پائیں گے۔

خیر! سب ٹیموں کے دن پھریں گے۔ ویسٹ انڈیز کا ظلم و جبر ختم ہوا، ایک دن آسٹریلیا کا بھی ہوگا۔ تمام ٹیموں کو چاہیے کہ وہ کچھ نہ کریں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہیں کہ آسمان سے کوئی ٹیم اُترے اور آسٹریلیا کے ظلم و جبر سے اُنھیں نجات دلائے۔

آخر......کینگرو کی ماں کب تک خیر منائے گی!

(مئی، دو ہزار سات)

* 'بائیسی ٹوٹنا' یعنی پوری فوج لے کر حملہ کرنا۔

ہَنوز بلّی دُور اَست

چوہوں کا انسانی زندگی میں اہم رول ہے۔ یہ چوہوں کا انکسار ہے کہ وہ جنگلوں میں آزادی سے گھومنے کی بجائے ہمارے گھروں میں گھسنے اور بلوں میں گھسنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض جانور دل میں گھر کر جاتے ہیں اور چوہے گھر میں بل کر جاتے ہیں۔ انسان پر دواؤں اور جرّاحی کے تجربے کرنے سے پہلے چوہوں کی ہی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ گویا دونوں ایک سی صفات کے حامل ہیں۔ انسان تو انسان، بلّی بھی مَرے ہوئے چوہے کو نہیں بخشتی۔ اُسے اُچھال اُچھال کر اپنے بچوں کو جھپٹنے پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کی مشق کراتی ہے۔ لیکن وہ بڑے ہو کر سب سبق بھول جاتے ہیں اور تمام عمر خواب میں چھیچھڑے ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ کہاں گئیں وہ بلّیاں، چوہے کو دیکھ کر جن کی 'رگِ ہلاکت' پھڑکتی تھی؟ دوسری طرف چوہے بھی اپنے بچوں کو بلّی سے بچنے اور اُسے چکما دینے کے گُر سکھاتے ہیں۔ لیکن وہ بھی بڑے ہو کر بلّی کو چکما دینے کی بجائے اُس کی چمکتی آنکھوں میں اپنی بجھتی آنکھیں ڈال کر چیلنج کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا پہلے ہی دن بلّی مارنا چاہتے ہوں۔

چوہوں کی ایک عادت ہمیں پسند نہیں کہ اُن کے ہاں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جتنا کھاتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ خانہ خرابی کرتے ہیں۔ اور جب اِن 'کھانا خرابوں' کی چوری پکڑی جاتی ہے تو بوکھلاہٹ میں یہ آگے پیچھے نہیں دیکھتے۔ بندوق کی گولی کی طرح سَٹ سَٹ چھوٹتے ہیں۔ بندوق کی گولی تو کم اَز کم لحاظ رکھتے ہوئے نشانے کے آس پاس سے گزر جاتی ہے،

لیکن یہ جس سے بچنا چاہتے ہیں اُسی کی ٹانگوں میں آجاتے ہیں۔ ڈسپلن تو چیونٹیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، وہ اپنی ترتیب بگڑنے نہیں دیتیں۔ اس ڈسپلن کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے، جس کی توقع چوہوں سے نہیں کی جاسکتی۔ اِن سے تو بلّی کے گلے میں ایک گھنٹی تک باندھی نہ گئی۔ یہ ناہنجار اَب تک اِس خوش فہمی میں ہیں کہ ہنوز بلّی دُور اَست!

چوہوں اور ہماری آنکھ مچولی کا کھیل بچپن سے چلا آرہا ہے۔ زندگی میں دو ہی چوہے ہمارے دل کو بھائے۔ اُن میں سب سے پہلے ہے، چالاک، بہادر 'جیری'۔ جس کی شرارتیں ہم نے ہنستے ہنستے برداشت کیں اور 'ٹام' کے خلاف قدم قدم پر اُس کی حمایت کی۔ اور دوسرے نمبر پر ہے وہ چُوہا، جس کی دُم کمپیوٹر سے جُڑی ہوتی ہے، جب کہ بقیہ چوہوں نے تو ہماری ناک میں دَم کر رکھا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ہماری ناک میں دُم کر رکھی ہے۔ ہم اِن کے بل بھرتے رہتے ہیں اور یہ پڑوسی کے گھر سے ہمارے گھر تک ایک نیا بل پاس کرتے ہیں۔ کاش! اِن کا بھی یہ شیوہ ہوتا کہ:

گھروں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

بات گھروں تک ہی موقوف نہیں، اِن کے حوصلے اِتنے بلند ہیں کہ یہ ہمارے پیٹ میں بھی دوڑتے ہیں۔ کاش! ہم چوہوں کا شکار رائج کر سکتے، تو گھر بیٹھے شکار کا شوق پورا کرتے۔ لیکن چوہوں کو مارنے میں ایک قباحت یہ ہے کہ ہم ہاتھ میں رائفل پکڑے، ایک پَیر مَرے ہُوئے، بلکہ مارے ہُوئے چوہے پر رکھ کر اپنی تصویر نہیں کھنچوا سکتے۔ جب چوہا نظر ہی نہیں آئے گا تو چوہا مارنے اور تصویر اُتروانے کا فائدہ؟ چوہا مارنے میں ایک قباحت اور بھی ہے کہ اِس کارنامے پر ہم فخر بھی نہیں کر سکتے۔ لوگ کہیں گے، ''گھر میں چوہا مارا! کس نے دیکھا''......یا پھر یہ کہ ''دیکھو! مارا تو کیا مارا!......چوہا؟......ہا......بڑا آیا ماؤس مار خاں!''

(جون، دو ہزار دس)

تصویر کے ہر رنگ میں......

تصویریں یوں تو خموش ہوتی ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تصویریں بہت کچھ بیاں کرتی ہیں، عیاں کرتی ہیں۔ بس دیکھنے والی 'آنکھیں' ہونی چاہییں۔ کہتے ہیں کہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہوتا ہے۔ ہم نے زندگی میں کئی تصویروں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، لیکن کبھی ہمیں تصویر کا دوسرا رُخ نظر نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ اِس کے دیکھنے کے لیے بھی وہ نظر ہونی چاہیے۔

یہ تصویریں بھی عجب تماشے دِکھاتی ہیں۔ کسی بھی اجتماعی تصویر کے دونوں سروں پر جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں وہ تصویر کے فریم میں قدرے اندر کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ شاید اُنہیں فوٹو گرافر کی 'نیت' اور 'مہارت' پر شک ہوتا ہے کہ وہ کہیں اُن کا سَر قلم نہ کر دے یا کوئی بازُو نہ کاٹ دے، جب کہ فریم میں اِتنی گنجائش ہوتی ہے کہ دونوں سروں پر کھڑے لوگ اگر لیٹ بھی جائیں تب بھی اِتنی جگہ ہوگی کہ فوٹو گرافر خود بھی آ کر 'انگڑائی' لے سکے۔ اور جو لوگ تصویر میں بیچوں بیچ کھڑے ہوتے ہیں وہ پورے فریم کا احاطہ کرنے کی کوشش میں کچھ اِس طرح چوڑے ہو ہو کر کھڑے ہوتے ہیں کہ دونوں سروں پر کھڑے لوگوں کو لیٹنے کا موقع نہ مل سکے۔

گروپ فوٹو میں ہر کوئی اپنے آپ کو نمایاں سمجھتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ سب چہرے دُھندلے ہیں اور وہی ایک اُجلا اُجلا ہے۔ ہمارے دوست پُر جوش پُوری نے ایک مرتبہ اپنے کالج

کے زمانے کی ایک اجتماعی تصویر دِکھا کر پوچھا،''بتاؤ نادِر خان! اِس میں... مَیں کہاں ہوں؟''

ہم نے تمام شکلوں پر اُنگلی رکھ کر پوچھا،''یہ؟''......''یہ؟''

اُنہوں نے کہا،''نہیں''......''یہ بھی نہیں۔''

ہم نے تصویر کو خوب آڑا ترچھا کر کے دیکھا، یہاں تک کہ کوئی صورت نہیں بچی۔ ہم نے چوکر تصویر میں موجود ایک بے چارے کُتے پر اُنگلی رکھی اور ڈرتے ڈرتے آہستہ سے پوچھا،''یہ......؟''

وہ چراغ پا ہوگئے۔ ہم نے صفائی پیش کی کہ کُتے کی توہین ہمارا مقصد نہیں تھا۔ پھر بھی اُنہوں نے ہمیں خوب آڑی ترچھی سنائیں اور وہ مُعما خود ہی حل کر دیا کہ''اِس تصویر میں......مَیں تصویر کھینچ رہا ہوں!''

کسی انعامی تقریب کی تصویر دیکھ کر یہ پتا نہیں چلتا کہ تصویر میں کون انعام دے رہا ہے اور کون لے رہا ہے۔ دونوں ہی کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون انعام دے کر مسکرا رہا ہے اور کون لے کر۔

تصویر کَشی (Photography) اب ہر اَہم کام سے زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ ایک مرتبہ وزیرِ صحت، پولیو بچاؤ مُہم کا آغاز بچوں کو خود اَپنے ہاتھ سے دوا پلا کر کر رہے تھے۔ سچویشن دیکھیے! بچے کو ایک نرس نے تھاما ہے۔ اُس کے ایک طرف وزیر اور دوسری طرف بچے کی ماں کھڑی ہے۔ نرس اور ماں کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہیں اور وزیر...... مسکرانے والوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ بچہ؛ وزیر کی طرف غصیلی آنکھ سے دیکھ کر رونے کی تیاری کر رہا ہے اور دَوا اُس کی ناک میں جا رہی ہے۔ بعد میں وزیر سے جب اُن کے سیکریٹری نے کہا،''صاحب! دوا تو بچے کی ناک میں جا رہی تھی۔ وزیر نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا،''دوا چاہے کہیں بھی جائے، ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔''

شادی کا جب قصد کیا جاتا ہے، تب تصویروں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ لڑکا قصداً اپنی جوانی کی تصویر بھیجتا ہے اور لڑکی والوں کو مجبوراً گوری رنگت والی تصویر بھیجنی پڑتی ہے۔ ہمارے دفتر کے چپراسی نے اپنی شادی کے لیے (خود کو پسند کروانے کے لیے) جو تصویر بھیجی تھی اُس میں وہ اپنے

باس(BOSS) کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ آرام کرسی پر ٹیک لگائے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ''میں کام...... وام نہیں کرتا۔'' لیکن اُس سے ایک بھول یہ ہوگئی کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے جھاڑن نہیں چھوڑی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ اُس کا رشتہ اُسی جھاڑن کی وجہ سے پکا ہوگیا۔ لڑکی والوں نے کہا، ''دیکھو! کتنی سادگی ہے اِس لڑکے میں، اپنے دفتر کی صفائی خود کرتا ہے!''

فوٹوگرافر اپنی زندگی میں جو لفظ سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، وہ ہے 'اِسمائل' (Smile)۔ مسکراہٹ کے یہ طلب گار یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ مسکراہٹ کے بِنا 'خطا کا پُتلا' محض ایک 'پُتلا' نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ لوگ حد کر دیتے ہیں، موقع دیکھتے ہیں نہ محل، شادی کی تقریب میں دُلہن کے ساتھ کھڑے دُولہے سے کہتے ہیں...... ''مسکراؤ!''

پُر جوش پُوری نے اپنی شادی میں ایک فوٹوگرافر کے کیمرے کے ساتھ اُس کا 'منہ' بھی توڑا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ فوٹوگرافر اُنھیں بار بار سہرے کے پیچھے مسکرانے کو کہہ رہا تھا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ پُر جوش پُوری نے کسی کو منہ توڑ جواب دیا ہو۔

شادی کی تقریب میں سب سے اہم مہمان، کیمرا مین ہوتا ہے، سب کی توجہ کا مرکز۔ شادی میں تصویریں اِس لیے بنوائی جاتی ہیں کہ میزبانوں کو ہوش ہی نہیں رہتا کہ کون آیا، کون گیا؟ وہ سب تو انتظامی اُمور میں مصروف ہونے کی اداکاری میں مصروف رہتے ہیں۔ شادی کے بعد سب کمر سیدھی کر آرام سے ریکارڈنگ دیکھتے ہیں کہ کون کون 'نہیں' آیا تھا اور کس نے کیا نہیں دیا۔ عورتیں یہ دیکھتی ہیں کہ کس نے کیا پہنا تھا اور اپنے منہ پر کیسا میک اَپ تھوپا تھا۔ ہمیں تو تعجب ہوتا ہے کہ عورتیں میک اَپ کے باوجود ایک دوسرے کے چہرے کیسے پہچان لیتی ہیں!

پُر جوش پُوری کہتے ہیں، ''ایک زمانے میں مجھے تصویر اُتارنے کا بے حد شوق تھا۔ میں تصویریں اُتار...... اُتار کر دیوار پر ٹانگتا تھا اور میرے ابو دیوار پر ٹنگی تصویریں اُتار...... اُتار دیتے تھے۔''

ہم نے کہا، ''گویا دونوں کو ایک ہی شوق تھا۔ دونوں ہی تصویریں اُتارتے تھے۔''

پُر جوش پُوری منہ بسُور کر بولے، ''جی ہاں! ہم دونوں ہی تصویریں اُتارنے پر اُتارُو تھے۔''

ایک مرتبہ پُر جوش پُوری نے ہمیں اپنے گھر مہمان کیا۔ اُس روز اُنہوں نے اپنے گھر کی

دیوار پر ٹنگے فریم میں بندوق کے سہارے بمشکل کھڑے، لٹکی ہوئی مونچھوں والے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا،''یہ ہمارے دادا جان ہوا کرتے تھے۔اُن کا نشانہ اِتنا پکا تھا کہ وہ اُڑتی چڑیا کو گِرا کر اُس کے پَر گِنتے تھے۔ اِس تصویر میں اُن کے پیر تلے جو شیر نظر آ رہا ہے، جس کے ساتھ دادا جان کی تصویر گاؤں والوں نے زبردستی اُتروائی تھی۔ اُسے مارنے کا اُن کا ارادہ قطعی نہیں تھا۔ وہ تو فقط شیر کی ناک پر بیٹھی مکھی پر اپنا نشانہ آزما رہے تھے۔''

ہم نے کہا،''واہ! کیا کمال کا نشانہ پایا تھا۔''

بولے،''دوست! نشانہ ہی نہیں، بندوق بھی کمال کی پائی تھی، جس کی دھاک سے اچھی اچھی 'قابض' فوجیں دَست بردار ہو جائیں۔

ہم نے بندوق کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا،''بڑی 'قبضہ کُشا' بندوق ہے۔''

''اور نہیں تو کیا!'' اُنہوں نے تائید کی،''تم جیسوں کو تو اِس کا دَستہ دیکھ کر ہی اِفاقہ ہو۔''

پتا نہیں سب سے پہلی تصویر کس نے کھینچی تھی اور کس کی کھینچی تھی۔ پہلے جب کیمرا نہیں تھا، تب سامنے بٹھا کر تصویر بنوائی جاتی تھی۔ نواب ہو یا نواب زادی، اپنا سارا کام کاج (جو ہوتا نہیں تھا) چھوڑ کر مصور کے سامنے تصویر بنے بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کی ناک پر بیٹھی مکھی بھی مصور ہی اُڑاتا تھا۔ باقی وقتوں میں وہ خود مکھیاں اُڑایا کرتے تھے۔

غالب کو بھی مصوری سیکھنے کا شوق چرایا تھا۔ اسی لیے تو اُنہوں نے یہ شعر کہا:

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

پتا نہیں، غالب نے مصوری سیکھ کر مصوری کی بھی یا نہیں۔ اور اگر کی بھی ہو تو ممکن ہے فارسی کے بارہ ہزار اَشعار کی طرح اُن کی مصوری کے فن پارے بھی زمانہ در زمانہ، عصرِ جدید کی پرت تلے کہیں دب کر رہ گئے ہوں گے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بیشتر اَدیب، شاعر اور صحافی اپنی ہر تازہ تحریر کے ساتھ اپنی باسی تصویر چسپاں کرتے ہیں۔ لوگوں کو تحریر کے ساتھ ساتھ تصویر بھی جھیلنی پڑتی ہے۔ مضمون کے ساتھ تصویر کے ہونے سے تبصرہ

نگار کے لیے فرار کی راہ بآسانی کُھل جاتی ہے۔ وہ فقط تصویر کی تعریف کر کے صاف بچ نکلتا ہے۔

تصویر اُتروانے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اِس بہانے بندے کو مسکرانے کا ایک بہانہ مل جاتا ہے۔ یوں بھی تصویر اب ایک اہم دستاویز میں شمار ہونے لگی ہے۔ برتھ سرٹیفکیٹ سے لے کر ڈیتھ سرٹیفکیٹ تک کا سفر تصویر کے بغیر طے کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مرنے کے بعد بھی انسان تصویروں میں مسکراتے ہوئے زندہ رہتا ہے۔

تصویروں کی نمائش بھی ہوتی ہے، مقابلے ہوتے ہیں۔ مقابلے میں ایسی تصویر کو پہلا انعام ملتا ہے، جس میں بھکمری کا شکار بچہ نظر آتا ہے۔ جس کا پیٹ اُس کی پیٹھ سے لگا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں ہر طرف سے پچکا ہوا خالی برتن اور کیمرے کی طرف خالی خالی تکتی اُس کی حلقوں میں دھنسی آنکھیں۔ ایسی تصویر کو دیکھنے والے بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں، ”واہ! مصور نے تصویر میں حقیقت کے رنگ بھر دیے ہیں!“ ظاہر ہے، حقیقت میں تو اُس منظر میں کوئی رنگ نہ تھا۔ اِس پر مصور کو انعام و اِکرام سے نوازا جاتا ہے۔ تصویر میں نظر آنے والے ایسے بھوکے ننگے بچے نہ جانے کتنے آسودہ حال لوگوں کا پیٹ اور اُن کی جیبیں بھرتے رہتے ہیں۔ کاش! کوئی اُس حقیقت میں بھی رنگ بھر دے۔

وطن سے دُور...... پردیس میں رہنے والے کا گزارہ تصویروں پر ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو تصویر میں 'ڈھلتے' دیکھتا ہے۔ ہر بار تصویر میں نیا رُوپ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر تصویر میں پتھرائی اُن آنکھوں میں 'وہ' انتظار دیکھ نہیں پاتا۔ دوسری طرف بیوی......تصویر کے ایک رُخ پر ہی اپنے شب و روز گزار دیتی ہے۔ کتنے ہی سُہانے پَل اُس کے احساس کو چھوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ اُس کے بچے تصویروں میں ہی بڑے ہوتے ہیں، جوان ہوتے ہیں۔ باپ کی شفقت اُن تصویروں کے ہی حصے میں آتی ہے۔ اُس کی بیٹی تصویر میں دُلہن بن کر تصویر ہی میں رُخصت ہوتی ہے۔ اور باپ......آنسو کے چند قطرے تصویر پر بہا کر، محرومی اور اُداسی کی تصویر بن جاتا ہے۔ یوں تصویروں کی کڑیاں جوڑتے جوڑتے اُس خاندان کے ہر فرد کی زندگی ایک باتصویر کہانی بن جاتی ہے۔

کچھ تصویریں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں تو کچھ مجبوری کی تصویر ہوتی ہیں۔ تصویر میں کئی رنگ ہوتے ہیں۔ ہر رنگ میں کئی تصویریں ہوتی ہیں۔ تصویریں بہت کچھ بیاں کرتی ہیں، عیاں کرتی ہیں، پَر دیکھنے والی وہ آنکھیں ہونی چاہییں۔ تصویر کے کئی رُخ بھی ہوتے ہیں، پَر دیکھنے والی وہ نظر ہونی چاہیے۔

(نومبر، دو ہزار سات)

ٹرکی ادب

شاعری سے ہماری دلچسپی اُس عمر میں ہی شروع ہو گئی تھی، جب دادی ماں کی نثری کہانیوں کا سلسلہ تھم گیا تھا اور جب سے ہم نے ٹرکوں کے پیچھے دوڑنا شروع کیا تھا۔ شُومیِ قسمت کہ اُس وقت خدوخال ایسے نہ تھے کہ کوئی ہمارے ہاتھ میں شاعری کی کتاب تھماتا اور کہتا، ''خوش فہم اور حرف آشنا ، نادر خان کے ذوقِ مطالعہ کی نذر''۔ اُن دنوں ہمیں اِس بات کا بھی علم نہ تھا کہ شاعری میں کون غالب ہے اور کس کا اقبال بلند ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا! ''شعر اور شاعر چھپائے نہیں چھپتے۔'' الغرض اشعار کہیں نہ کہیں سے ہمارے کانوں میں اور سَر پر پڑتے رہے۔ سب سے پہلا جو شعر ہم نے سنا، وہ یہ تھا:

پڑھو گے لکھو گے، بنو گے نواب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب

یہ شعر ہم جب بھی سنتے تھے، کان کھول کر سنتے تھے اور جس کان سے سنتے تھے اُسی سے نکال دیتے تھے۔ ہم یہ سوچتے تھے کہ اگر یہ شعر معنوی اعتبار سے صحیح ہے تو جتنے نواب گزرے ہیں، اگر پڑھ لکھ کر نواب بنے تھے تو پھر وہ شاعروں کو اشرفیوں کی پوٹلیاں دے دے کر کیوں پڑھواتے تھے؟

اور جب کھلاڑی کھیل کود کر خراب ہوتے ہیں تو اُن کو کھِلا کھِلا کر نوٹوں کی گڈیاں اُن کے ہاتھ پر کس لیے رکھی جاتی ہیں؟ وہ گڈیاں اُن کے منہ پر کیوں نہیں ماری جاتیں؟

خیر! بات ہو رہی تھی، اپنے کھیل کود کے دنوں کی اور خراب ہونے کی۔ اُن دنوں ہم نے شوقِ مطالعہ کے جوش میں بے شمار دکانوں کے سائن بورڈ، نرخ نامے اور ریستورانوں کے مینو پڑھ ڈالے تھے۔ مطالعہ کا شوق اور بڑھا تو راستوں کے اشتہارات اور دیواروں پر لکھی بچوں کی شرارت آمیز تحریریں پڑھنے لگے۔ بلکہ بعض اشتہارات اور تحریروں میں اپنے پلّے سے نقطے بڑھا گھٹا کر محظوظ بھی ہوتے رہے۔ پھر ذوق اور قد مزید بڑھا تو ٹرکوں کی پُشت پر لکھے اشعار پڑھنا شروع کر دیے۔ لیکن ٹرکوں کے مطالعہ سے پہلے ہمیں نوِشتۂ ٹی شرٹ پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ہم بڑے ذوق و شوق سے ٹی شرٹ پر لکھی مشکل سے مشکل تحریریں پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم ایک ٹی شرٹ پر ناہموار اور آپس میں گتھم گتھا تحریر پڑھنے میں منہمک تھے کہ ایک زوردار تھپڑ نے ہمیں اُس تحریر کے فُسوں سے باہر نکالا اور بتایا، ''اَے قاریِ ناپُختہ کار! خواتین بھی ٹی شرٹ پہنتی ہیں۔ تحریر پڑھنے سے پہلے ذرا پسِ تحریر بھی دیکھ لیا کر!'' وہ تھپڑ کیا تھا، ہماری توبہ تھی، ایسی توبہ جس میں گال ہمارا تھا اور ہاتھ کسی اور کا۔ اُس ایک گال والی توبہ نے ہم پر یہ راز بھی اِفشا کیا کہ کیا وجہ ہے جو...... ٹی شرٹ پر اشعار نہیں لکھے جاتے۔ ٹی شرٹ پر لکھے اشعار پڑھنے اور سمجھنے کے لیے نگاہ کا ایک جگہ ٹھہرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور جس پر نگاہ ٹھہری ہو اُس کا اپنے دونوں ہاتھ باندھے ایک جگہ ٹھہرنا اُس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

دراصل شاعری کو عوام تک پہنچانے میں چھوٹے چھوٹے بالا خانوں کے بعد بڑے بڑے آوارہ ٹرکوں کا ہاتھ رہا ہے۔ بالا خانوں میں لوگ گاؤں گاؤں اور شہر شہر سے راہ بھٹک کر اشعار سننے آتے تھے، جب کہ ٹرک! گاؤں گاؤں اور شہر شہر، بھٹک بھٹک کر لوگوں کو اشعار پڑھواتے پھرتے ہیں۔ بالا خانوں میں شعر فہم حضرات آٹھوں پہر موجود رہتے تھے، اِس لیے وزن میں گڑبڑ کا امکان کم ہی ہوتا تھا (یاد رہے! شعر کے وزن کی بات ہو رہی ہے)۔ لیکن ٹرکوں پر لکھے اشعار میں بے شمار فنی اور تکنیکی خامیوں کی شکایتیں آئے دن موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اِس کی اہم وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی ٹرک ڈرائیور...... ڈرائیور ہونے کے ساتھ ساتھ عروضی میکانک نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے

دوست پُر جوش پُوری کا خیال ہے کہ ڈرائیور کا شعر فہم ہونا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ شعر کی 'تقطیع' میں اُلجھ کر راہ گیروں کی 'تقطیع' کرتا پھرے گا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ٹرکوں کے اشعار کے اَوزان میں گڑبڑ کا اہم سبب ہمارے ہاں کے اُوبڑ کھابڑ راستے ہیں۔ یوں بھی آڑے ترچھے، ہلتے ڈُلتے ٹرکوں پر نظر ٹکا کر اشعار پڑھنا کوئی شعر کہنے جیسا آسان کام نہیں۔ اِس میں غلطی کا بھی امکان ہوسکتا ہے۔ سارا اِلزام ٹرک والوں کی پشت پر ڈالنا ٹھیک نہیں۔ اور آپ کو پتا ہے؟ راستے پر ٹریفک کا اِتنا شور ہوتا ہے اور اُس پر ٹرک بھی پورا زور لگا کر طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہیں......تو بتائیں! اِتنے غُل غپاڑے میں اشعار کیا خاک 'پڑھائی' دیں گے؟

پُر جوش پُوری کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ کہ اُن کا جواب کتنا صحیح ہوتا ہے۔ بہر حال، جواب ہوتا ضرور ہے۔ اُن سے جب ہم نے پوچھا کہ ٹرکوں کے پیچھے اشعار کیوں لکھے جاتے ہیں تو اُنھوں نے بڑا ہی دلچسپ جواب دیا۔ وہ یہ کہ خراماں خراماں چلنے والے ٹرکوں کے پیچھے صبر کے ساتھ چلنے والوں کی دل جُوئی ہو اور اُن کا راستہ آرام سے کٹے۔ ہم نے کہا، ''پھر تو ٹرکوں پر پورا پورا دیوان لکھ دینا چاہیے۔ ایک شعر پڑھنے میں کیا وقت لگتا ہے۔ اب شروع ہوا اور اَب ختم۔'' پُوری جی ذرا خفگی سے بولے، ''نادر شاہ! تم کیسے سمجھوگے؟ بعض پڑھنے والے شعر صرف پڑھتے ہی نہیں، شعر کی تِکّا بوٹی بھی کرتے ہیں، زمین دیکھتے ہیں، بحر دیکھتے ہیں، بحث کرتے ہیں۔ ایک شعر پر دس دس اشعار کی تہ جما دیتے ہیں۔'' ہم نے کہا، ''اِس سے تو اَچھا ہے کہ آدمی ٹرک چلائے، کیوں کہ ٹرک کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی منزل تک پہنچتا تو ہے، جب کہ بحث کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتی۔''

ٹرک والوں کی دیکھا دیکھی اب چھوٹی گاڑی والے بھی اپنی پُشت پر اشعار کندہ کرنے لگے ہیں، لیکن وہ فقط چھوٹی بحروں والے ہی اشعار چنتے ہیں، طویل بحروں کو اُن کی پیٹھ کے دو کنارے اپنے اندر سما نہیں پاتے۔

ہم جو بچپن سے ٹرکوں کا مطالعہ کرتے آ رہے ہیں، ایک اچھا خاصا تجربہ ہمیں اِس میں حاصل ہوا ہے۔ لیکن اَلمیہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو اَشعار کا ذخیرہ اکٹھا ہوا ہے، اُس میں مکمل

اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شعر نوٹ کرتے وقت ایسا اکثر ہوا ہے کہ ہم نے ابھی مصرعِ اُولیٰ نوٹ کیا نہیں کہ ٹرک نے دہاڑ ماری، دُھواں اُڑایا، نظروں سے اُوجھل ہوا...... ''اور ہم کھڑے کھڑے غُبار دیکھتے رہے۔'' نتیجہ یہ کہ ہمارے پاس مصرع ہائے اُولیٰ کی بھرمار ہوگئی۔ ہائے!

ٹرکوں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

ہم نے اُن لاوارث مصرعوں کو اُن کے حال پر چھوڑا اور آگے بڑھ کر 'ٹرکی ادب' پر تحقیق شروع کی تو چونکا دینے والے حقائق سامنے آئے۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک ٹرک کو روکا اور پوچھا،
''خان صاحب! ٹرک پر یہ شعر آپ نے کیوں لکھا ہے؟''
وہ متعجب ہو کر بولے، ''وَئی! کیا بکواس کرتی اَے! یہ شیر اَے؟''
''میں بکواس نہیں کرتی۔'' ہم نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''میں بکواس کرتا ہوں۔''
وہ ہماری ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے نِوالے کی طرح پکڑ کر بولے، ''نارااااض کیوں اَوتی اَے۔ اَم تو سمجھتا اَئے کہ یہ بیل بُو ووووٹا اَئے، نقش نگار اَئے۔''
ہم نے کہا، ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اُردو رسم الخط کو اَب لوگ نقش و نگار اور بیل بُوٹے ہی سمجھنے لگے ہیں۔''

ہمارے ایک ٹرانسپورٹر دوست ہیں، جن کا ٹرکوں کا دیوان ہے۔ اُن کے ہاں شام کو جب تمام ٹرک محمود و ایاز کی طرح ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ بیت بازی کی محفل جمی ہے۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ بھئی آپ شعر کے ساتھ شاعر کا نام کیوں نہیں لکھتے؟ تو کہنے لگے، ''لکھتے تھے بھئی! لکھتے تھے، لیکن اِس سے فتنہ جاگنے لگا۔ لوگ راستے میں ٹرک روک روک کر یہ بحث کرنے لگے کہ یہ شعر فلاں شاعر کا نہیں، فلاں کا ہے۔ بعض لوگ تو شعر کے اپنا ہونے کا دعویٰ بھی کر دیتے تھے۔ تو بھئی! ہم نے کہا، ختم کرو قصہ! مٹاؤ نام! نہ ہَز ہَز نہ بَدبَد۔'' ہم نے اُن سے بھی وہی سوال پوچھا، ''آپ ٹرکوں پر اشعار کیوں لکھتے ہیں؟'' وہ بولے، ''بس ایسے ہی۔ سب لکھتے ہیں تو ہم بھی لکھتے ہیں۔'' ہم بہت مایوس ہوئے کہ ہمارے اِس سوال کا جواب ٹرک والے ہی نہ دے سکے تو اَب کون دے گا؟

خیر! وجہ جو بھی ہو۔ ٹرکوں نے صرف ڈھول ہی نہیں اُڑائی، شور ہی نہیں مچایا، بلکہ مشاعروں اور اَدبی محفلوں سے دُور بیٹھے عام آدمی تک شاعری کی مہک بھی پہنچائی ہے۔ نت نئے اشعار سے راہ چلتے، تھکے ہارے ذہنوں کو تازگی بخشی ہے۔

چلتے چلتے ہم آپ کو اپنے ٹرانسپورٹر دوست کے ٹرکوں کے دیوان سے منتخب اشعار کے ساتھ چھوڑے جارہے ہیں، اِس اُمید کے ساتھ کہ آپ بحر نہیں دیکھیں گے، بحث نہیں کریں گے۔

ٹرک نمبر: MMZ- 2581 :

نہ ملا ہے نہ ملے گا مجھے آرام کہیں
میں مسافر ہوں، مری صبح کہیں شام کہیں

ٹرک نمبر: MSE- 3617 :

یہ کیا بات ہے کہ مِلیں تو ہمیں مِلیں
اپنے نگر بُلاؤ، ہمارے نگر نہ آؤ

ٹرک نمبر: MMA-6283 :

چلنے کو چل رہا ہوں، مگر جی اُچٹ گیا
آدھا سفر تو خاک اُڑانے میں کٹ گیا

(اپریل، دوہزار آٹھ)

چھوٹے موٹوں کا بچپن

کسی اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی کہ ایک معروف گلوکار نے اپنا وزن ستر کلو (70kg) گھٹا لیا۔ ہم اگر ایسا کریں تو ہمارا کُل وزن گھٹ کر منفی پانچ کلو، یعنی minus 5kg رہ جائے۔ بات سوچنے کی ہے۔ آپ ہی سوچیں......

موٹے طور پر دیکھا جائے تو موٹاپا خود ایک موٹی بیماری ہے اور اِسے دُور کرنے کے لیے روزانہ کم اَز کم آدھا گھنٹہ تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرنا ضروری ہے۔ ویسے یہ کام موٹاپا آنے سے پہلے کرنا چاہیے، کیوں کہ بغیر بوجھ کے آدھا گھنٹہ چلنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ موٹاپے کے ساتھ آدھا گھنٹہ چلنے کے لیے آپ کو پورا ایک گھنٹہ درکار ہوگا اور اُس پر تیز قدم چلنے سے فربہ اندام کمر کے لچک جانے کا بھی موٹا امکان ہے۔ یوں تو آج کل ایک خاص طبقے میں چہل قدمی کا چلن چلا ہے، لیکن اُس میں چہل قدمی کم اور 'چُہل قدمی' زیادہ ہوتی ہے۔ اور جب دو خواتین مِل کر چہل قدمی کرتی ہیں تو وہ چہل قدمی پہلے سَہل قدمی ...... پھر چُغل قدمی بن جاتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان ہوتے ہوتے موٹا ہوتا تھا۔ لیکن اب؟...... ہوتے ہی موٹا ہوتا ہے۔ موٹاپے کا بوجھ اب بچوں پر بھی آن پڑنے لگا ہے۔ وہ اپنے 'بچپن کے دشمن' میاں موٹاپے کو پَل پَل

اُٹھائے پھرتے ہیں اور ہر پل اُسے اُتار پھینکنے کے لیے بے چین بھی رہتے ہیں۔ یوں تو موٹاپے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ موٹاپا کچھ بچوں کو وراثت میں بھی ملتا ہے۔ بعض والدین جائداد کا بٹوارہ کرنے سے پہلے بچوں میں موٹاپے کا بٹوارہ کر دیتے ہیں۔ بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ!

کچھ بچوں کو یہ موٹاپا اُن کے کرتوت کی وجہ سے بھی ملتا ہے۔ ویڈیو گیمز میں اُچھلنے کودنے والے اور جنک فوڈ کھانے والے آج کل کے یہ بچے نہ تو اسکول میں دوڑتے ہیں نہ گھر میں ہلتے ڈُلتے ہیں۔ اگر اِن سے کوئی چیز لانے یا بڑھانے کو کہو تو ٹَس سے مَس نہیں ہوتے۔ اور ایک ہم تھے کہ دوڑ کر اسکول جایا کرتے تھے اور اکثر بھاگ کر آجایا کرتے تھے۔ پھر ہر دوسرے دن مُرغا بھی بنتے تھے۔ ایک تو بھاگو دوڑو اور اُس پر مُرغا بھی بنو۔ گھر میں جب ہمیں کوئی سَودا لانے کو کہتا تو ہم خوش ہوتے کہ اِس بہانے ہمیں گھر کی قید سے 'باشرارت بَری' ہونے کا موقع ملتا اور اُوپر کی کمائی الگ ہوتی۔ ساتھ ہی ہم گھر سے بازار تک اور بازار سے گھر تک گُم...... یا چکّر کاٹ کر آتے۔ لگے ہاتھوں راستے میں محلّے کے لڑکوں کے چلتے کھیل میں گُھس کر، دو تین داؤ بھی کھیل لیتے اور جاتے جاتے کھیل بگاڑنے کی پاداش میں رفقاء کے ساتھ ہاتھا پائی میں پخّنیاں بھی کھاتے۔ راستے میں اگر کوئی درخت ہماری طرف آتا دکھائی دیتا تو اُس کی جھکی ہوئی ڈال سے لٹک کر جھولا جھولتے۔ کسی کُتے کے پلّے کو دوڑا کر اُس کے پیچھے دوڑتے، یہاں تک کہ وہ شاطر پلاّ ہمیں بڑے بڑے کتوں کے جم گھٹ میں لا کر چھوڑ دیتا۔ پھر وہ سب مل کر ہمیں اُلٹے پاؤں دوڑاتے۔ اور ہم پیچھے دیکھے بغیر دُم دبا کر بھاگتے۔ یہاں تک کہ ہمارا گھر دوڑ کر ہمارے پاس آجاتا۔ اب بتائیں! ایک چھوٹی سی مُہم میں ہم اِتنے سارے کام بھگتا کر لوٹتے تھے، تو بھلا! موٹاپے کی کیا مجال جو ہمارے آس پاس بھی پھٹکتا۔

کوئی بچہ اپنا بستہ بڑی مشکل سے اُٹھا پاتا ہے۔ اسکول جاتے وقت بستے کے بوجھ سے کمر جھکی جھکی جاتی ہے (اسکول سے لوٹتے وقت بھی جھکتی ہے، مگر اُتنی نہیں) جب کہ ایک موٹا تازہ بچہ جو دَس، بیس کلو...... چربی دار گوشت اپنی نرم و نازک ہڈیوں پر، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے

جاگتے اُٹھاتا ہے۔ اگر اُتنا ہی گوشت کسی عام بچے سے، گوشت کی دُکان سے روزانہ منگوایا جائے تو سوچیں! اُس بے چارے کا کیا حال ہوگا۔

بچپن...... پلک جھپکتے گزر جاتا ہے۔ اِس مختصر سے عرصے میں کھیلنا، اُچھلنا، کودنا ہر بچے کا حق ہے۔ اور موٹاپا اُن کا یہ حق دَبا دیتا ہے۔ ہم تو ہمیشہ یہ دعا کرتے ہیں کہ کسی دشمن کے بچے کو بھی موٹاپا نصیب نہ ہو۔ دوست کے بچے کو تو ہو ہی نا! اُس کو کھلانے پلانے اور گود میں اُٹھانے میں ہی ہمارا حال پتلا ہوگا۔ سو...... اپنے تمام دوستوں کو ہمارا یہ نہایت ہی کم وزن مشورہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو موٹاپے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں کہ اُن سے یہ دوستی نبھائی نہ جائے گی۔ اُن سے یہ بوجھ اُٹھایا نہ جائے گا۔

(مارچ، دو ہزار آٹھ)

خاکہ

قدیم خاں اَزَلی

قدیم خاں اَزَلی ......! نام سن کر یہ گمان ہوتا ہے کہ موصوف کی عمر کم اَز کم ایک ہزار سال تو ہو گی۔ اور عمر کی یہ تحدید بھی اِس بنیاد پر کی ہے کہ ہم کسی انسان کی اِس سے زیادہ عمر کا تصور نہیں کر سکتے۔

خیبر آباد کو خیر باد کہہ کر سعودی عرب میں اپنی جوانی ضائع کرنے والے اِس مہاجر تاجر نے نہ معلوم کتنے اُلجھن کے کاروبار کیے۔ اُن کا اصل کاروبار پارکنگ شیڈز بنانا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی متعدد کاروبار میں ہاتھ مارتے ہیں، پھر کچھ دنوں بعد...... لات!

اَزَلی کا ظاہری قد کرۂ ارض کے انسانوں جیسا ہی ہے، لیکن شخصیت کا قد پوچھیں تو ناپنا اِتنا آسان نہیں کہ وہ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ اَزَلی سعودی عرب میں بیشتر لوگوں کو قریب سے جانتے ہیں۔ اِسی لیے تھوڑے اُن کے دوست ہیں اور دشمن زیادہ۔ کسی اَدیب کے لیے دشمنوں سے زیادہ نقادوں کی تعداد سُود مند ثابت ہوتی ہے۔ اَزَلی پر زبانی تنقید کرنے والے تو بہت ہیں، مگر تحریری طور پر شاید ایک بھی نہیں۔

مزاح کا عنصر اُن کی طبیعت میں شامل ہے۔ اُن کی سنجیدہ گفتگو بھی سامع کو مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مجھے یہ علم نہیں کہ مزاح اُن کا اوڑھنا بچھونا بھی ہے یا نہیں، مگر اِتنا جانتا ہوں کہ وہ

ایک کھاتے پیتے مزاح نگار ہیں۔ اپنے مزاج کے 'جیم' کا نقطہ نکال کر اپنی تحریر میں مزاح بھرتے ہیں۔ اور جب تقریر کرتے ہیں تو ایسی کہ...... پھول جھڑ جاتے ہیں۔

موصوف اکثر چین جاتے ہیں، مگر جیسے جاتے ہیں ویسے ہی پلٹ آتے ہیں! یعنی اتنا بھی نہیں ٹھہرتے کہ علم میں کچھ اضافہ کر سکیں۔ اُن کے پاؤں میں چکّر ہے۔ ایک سفر سے لوٹے نہیں کہ اَگلے سفر کا قصد کیا۔ سفر سے لوٹتے اِس لیے ہیں کہ تھک جاتے ہیں۔ پھر رختِ سفر باندھتے ہیں کہ تھک کر بیٹھنے کے عادی نہیں۔ اُنہیں برسوں سے جانتا ہوں (پرسوں سے نہیں! برسوں سے) لیکن کبھی غصّے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ البتہ اکثر پان پر غصہ اُتارتے ہوئے دیکھا ہے۔ پان سے اُنہیں سخت نفرت ہے۔ چبا چبا کر پان کا خُون کر دیتے ہیں۔ پھر کوئی مناسب جگہ دیکھ کر غصہ تھوک دیتے ہیں۔

موصوف کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ کبھی تعلقات نہیں توڑتے۔ آپ چاہیں گے تب بھی وہ نہ توڑیں گے۔ آپ تنگ آ جائیں گے، تب بھی نہیں۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے، یہ اور بات ہے کہ نوجوانوں میں کوئی نہ کوئی کسر رہ جاتی ہے۔ SMS کا جواب فوراً دے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی شک گزرتا ہے کہ کہیں اُردو کے ناقدین اور تبصرہ نگاروں کی طرح، بغیر پڑھے ہی جواب نہ دے دیا ہو۔ نماز میں خشیتِ الٰہی کا پاس ہے وگرنہ وہ حالتِ قیام میں بھی SMS کا جواب دیتے۔ کرکٹ کا شوق جنون کی باؤنڈری لائن تک ہے۔ کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے ہر اَہم کام کو ڈراپ کر کے فارغ ہو جاتے ہیں اور میچ دیکھنے میں ایسے مصروف ہو جاتے ہیں، جیسے کوئی کھلاڑی میچ کھیلنے میں۔

ازآلی تقاریب میں سانس لینے والے آدمی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ آپ سے چھپتے پھر رہے ہوں تو پریشان نہ ہوں۔ صرف مقامی تقاریب پر اَپنی نظر رکھیے۔ کسی نہ کسی تقریب میں، ڈائس پر یا اگلی نشست میں آپ اُنہیں اَدب میں رنگے ہاتھوں پکڑ سکتے ہیں۔ ہر تقریب سے پہلے کہتے ہیں کہ آج بہت اچھا پروگرام ہے اور ہر تقریب کے بعد کہتے ہیں کہ اچھا بھلا وقت ضائع ہوا۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں ایک عمر گزار دی کہ کبھی بھی کچھ اچھا نہیں ہوا اور کبھی تو کچھ اچھا ہوگا۔ دراصل ازآلی

ایک ایسی تڑپتی مچھلی ہے جو پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ پانی سے باہر آئے بغیر جی سکتی ہے۔
ہر تقریب میں اپنی شرکت سے ظلم ڈھاتے ہیں۔ اُس پر کبھی نظامت کی کمان سنبھال کر ظلم کی انتہا کر دیتے ہیں۔ اَزؔلی کا نام اِتنا چل گیا ہے کہ وہ کسی محفل یا جلسے میں اپنے مضمون میں حاضرین کو بُرا بھلا بھی کہیں تو حاضرین نہ اَزؔلی کو بُرا سمجھیں گے اور نہ خود کو۔ وہ جواباً یہی کہیں گے، ''کیا اچھا کہا ہے؟''...... ''کیا اچھا کہا ہے؟'' اَزؔلی اپنی تحریروں اور تقریروں میں لطیفوں کا فیاضانہ استعمال کرتے ہیں۔ اِس معاملے میں اُن کا منہ اُن کے ہاتھ کی طرح کُھلا ہے۔ لوگ اُن کے لطیفے سننے میں اِتنے مشاق ہو چکے ہیں کہ لطیفہ شروع ہوتے ہی لوگوں کے کان ہنسنے لگتے ہیں۔
اُردو کا دَم بھرنے والے بیشتر لوگ تقاریب میں شریک ہو کر یا کچھ پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذمّہ داری نبھالی۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں، یا پھر چشم پوشی کرتے ہیں کہ لفظوں کی جادوگری کے علاوہ نوٹوں سے بھری مٹھی بھی تقاریب کے انعقاد کے لیے ضروری ہے۔ اَزؔلی اکثر تقریبات کو ایسی ہی بند مٹھی سے مُکّے مار مار کر آگے بڑھاتے ہیں۔
لکھنا اَزؔلی کا شوقِ فضول ہے۔ اگر فکرِ معاش نہ ہوتی تو وہ صرف لکھتے اور بس لکھتے۔ تب لکھنا اُن کا ذریعۂ معاش ہوتا۔ فضلِ خداوند ہے (ہم پر) کہ لکھنا اُن کا ذریعۂ معاش نہیں، وگرنہ اُس معاش میں فکر نہ ہوتی۔ اَزؔلی نے لاکھ کوشش کی کہ اُردو کو ذریعۂ معاش بنایا جائے، لیکن ہزاروں، لاکھوں ادیبوں کی طرح وہ بھی دو دو کشتیوں میں سوار رَہے۔ نہ اِدھر دونوں ٹانگیں رکھ پائے نہ اُدھر۔ آخر! قلم کشی کر کے اَدب کے اُس اُفق پر اُبھرے، جس کے متعلق اُردو کا قاری اِس شش و پنج میں رہتا ہے کہ...... زمین اُوپر اُٹھ گئی ہے یا فلک نیچے آ گیا ہے۔
مزاح نگاری، افسانہ نویسی، معاشرتی، معلوماتی اور تفریحی مضامین اور جز وقتی شاعری اِن کے زورِ قلم کا عتاب سہنے والی اصناف ہیں۔ اَزؔلی کے پاس موضوعات کی کمی نہیں۔ موضوعات اُڑ اُڑ کر اُن کے پاس آتے ہیں، لیکن موصوف اِتنے مصروف ہیں کہ اُڑ اُڑ کر آنے والے اُن موضوعات میں سے بہت کم کو اَپنی مٹھی میں کر پاتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اَزؔلی خود ایک اُڑتا ہوا موضوع ہے جو کبھی کسی کی مٹھی میں نہیں آتا۔ موصوف جب کبھی وقت نکال کر لکھنے بیٹھتے ہیں تو بس لکھتے ہی

چلے جاتے ہیں۔ایک ہی بیٹھک میں دس بیس صفحات پر کسی موضوع کو قلمبند کر کے ہی قلم...... بند کرتے ہیں۔بیس صفحات اگر آپ کو زیادہ معلوم ہو رہے ہیں تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔وہ اِس سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ اِتنی تیزی سے مضامین لکھتے ہیں کہ لکھنے سے پہلے اُنہیں سوچنا نہیں پڑتا۔ لکھنے کے بعد تو بالکل ہی نہیں سوچتے۔ بقول اُن کے یہ کام قارئین کا ہے۔اپنی تحریروں پر نظرِ ثانی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ کام بھی قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔اُن کی تحریروں میں اپنے ملک سے اُن کا پیار صاف جھلکتا ہے۔وہ اپنے ملک کو کبھی نہیں بھولتے۔اِسی لیے تو جب چین کا سفرنامہ لکھتے ہیں تو کہیں بھی دیوارِ چین کا ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہاں خیبر آباد کا قدیم قلعہ نہیں ہے۔مگر افسوس! وہ اپنی تحریروں کو حفاظت سے نہیں رکھتے۔اَزؔلی کو اگر خون کے آنسو رُلانا ہو تو بس اِتنا کافی ہے کہ اُن تمام مسوّدوں کو جلا کر راکھ کر دیا جائے۔ یہ بات میرے اور آپ کے بیچ ہی رہے تو اچھا ہے۔اگر سب کو خبر ہوئی تو جلانے کو میرے اور آپ کے حصے میں کچھ بھی نہ آئے گا۔

ویسے اُن مسودوں کو جلانے کے خواہش مندوں میں دائیں اور بائیں بازو کے دوستوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔اُن ہی میں سے ایک دوست ایسے اُدیب ہیں جو اُپنے اُسلوب کی وجہ سے ہمیشہ خبروں میں رہتے ہیں۔اُن کے مضامین پڑھتے وقت یہ گمان گزرتا ہے کہ آپ لغت کے صفحات پڑھ رہے ہوں۔لغت میں تو یہ سہولت ہوتی ہے کہ آپ کو الفاظ کے معنی مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے قاری کو یہ سہولت نہیں دیتے، بلکہ اُردو کے سُست قاری سے لغت کا بوجھ اُٹھوا کر مشقت کروانا چاہتے ہیں۔کہیں کوئی تقریب یا نشست ایسی نہیں جو اُن کی نظامت کے عذاب سے نہ گزری ہو۔ فاضل دوست اور اَزؔلی میں کئی جنگیں گرم اور سَرد ہُوئیں۔اَزؔلی...... موصوف سے کہتے ہیں،''بھائی! تم ایک گلاس دودھ میں صرف ایک چمچہ پانی ملاتے ہو۔اِتنا گاڑھا اَدب بھلا کون ہضم کرے گا۔'' موصوف اَزؔلی سے کہتے ہیں،''میاں! تم تو ایک گلاس پانی میں ایک چمچہ پانی اور ملاتے ہو، بھلا اِسے کون دودھ کہے گا۔'' موصوف اَزؔلی کو بڑا اَدیب نہیں مانتے۔ممکن ہے دل کا حال مختلف ہو۔دل میں وہ اَدیب ہی نہ مانتے ہوں۔

اَزؔلی نے ایک عمر جہیز کے خلاف مُہم میں جھونک دی، بلکہ خود کو بھی اِس مُہم میں اُس عمر میں

جھونک دیا تھا جب اُن کو یہ پتا بھی نہیں تھا کہ شادی کا لڈّو کیا چیز ہوتی ہے۔لیکن جب پتا چل گیا تو جہیز نہ لینے کی عملی مثال پیش کرنے کے لیے دو...... دوشادیاں کیں۔جہیز کے خلاف اُزآلی کی مہم ہنُوز جاری ہے۔خدا خیر کرے! عملی مثال پیش کرنے کے مزید امکانات باقی ہیں، یعنی 'دو' خانے اب بھی خالی ہیں۔

جہیز کے موضوع پر موصوف نے اِتنا لکھا کہ ایک کتاب مرتب ہوگئی، جس میں اُنہوں نے مردوں کو غیرت دلائی ہے۔مُردوں کو نہیں! مَردوں کو! یوں بھی ایسے مَردوں کو مُردہ کہنا بے جا نہ ہوگا ، جو جہیز کے بدلے اپنے ضمیر کو......اور اپنی رُوح کو بیچ دیتے ہیں۔موصوف نے جوڑا جہیز کے علاوہ ازدواجی مسائل پر بھی لکھا اور بطور کونسلر متعدّد شادی شدہ جوڑوں کے مسائل (جو حقیقتاً ہوتے نہیں ہیں) بھی حل کرنے کی کوشش کی۔

اُزآلی ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی کارکُن بھی ہیں، لیکن وہ کبھی کسی رگروہ کا حصہ نہیں بنتے ، بلکہ ہر رگروہ میں اپنے حصے کر دیتے ہیں یا ہر رگروہ کے حصے بخرے کر دیتے ہیں۔ہر کام بنفسِ نفیس کرنا چاہتے ہیں۔کام بانٹنا اور سونپنا اچھا نہیں سمجھتے، اِسی لیے اِس کام میں، اُس کام میں خود بٹ کر رہ جاتے ہیں اور غیر ضروری مصروفیات میں مصروف رہتے ہیں۔غنیمت ہے کہ اِن کی دو ہی ٹانگیں ہیں، ورنہ اُن کے رکھنے کے لیے کشتیاں کم پڑتیں۔سنا ہے کہ اب وہ اپنا کاروبار اپنے بیٹے کو سونپ کر جھاڑ پھونک کا کام کریں گے۔یعنی......فلسفہ جھاڑیں گے اور اپنی جمع پونجی پھونکیں گے۔

اُزآلی قوم کی حالت دیکھ کر ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں۔قوم کے مسائل پر کھل کر بولتے ہیں اور ویسا ہی لکھتے بھی ہیں۔رات کو یہ سوچ کر سوتے ہیں کہ صبح جب میں اُٹھوں تو قوم کی حالت یکسر بدل چکی ہو۔پھر جب اُٹھتے ہیں تو سوئی ہوئی قوم کی حالت مزید اَبتر دیکھ کر یہ عزم کرتے ہیں کہ کچھ ایسا کیا جائے کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے سب کچھ بدل جائے۔وہ ہر بڑے کام کی شروعات ایک بڑے قدم سے کرنا چاہتے ہیں۔یوں تو بڑا قدم اُٹھانے کو وہ ہمہ وقت تیار ہیں، لیکن...... بڑا قدم اُٹھاتے اُٹھاتے اُس بڑے کام کی ہیئت بدل جاتی ہے۔یعنی کوئی دوسرا بڑا کام ذہن میں آجاتا ہے۔

اِس کام میں مصروف، اُس کام میں مشغول۔ اِدھر موجود، اُدھر موجود، اَزَلی تقریباً پندرہ ملکوں کی فضا میں سانس لے چکے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے شاید ہی کبھی جدہ کے بحرالاحمر کے کنارے اپنی تیز رفتار زندگی کو بریک لگا کر پارک کیا ہو اور پتلون کے پائینچوں کو گھٹنوں تک اُٹھا کر کھارے پانی میں پاؤں ہلکے کیے ہوں۔ پھر ڈوبتے سورج کے انتظار میں، ریت کے فرش پر کسی کروٹ لیٹ کر، انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچی ہوں اور اپنی الجھن سلجھائی ہو۔

اچھی خاصی عمر کرۂ ارض پر گزارنے کے بعد اَزَلی اب ایک اور زندگی کے خواہش مند ہیں۔ ایک بار......صرف ایک بار اِس دنیا میں آنے کا ایک موقع اور مل جائے تو قدیم خاں اَزَلی اُس زندگی کو بڑی احتیاط سے خرچ کریں گے۔ پچھلی زندگی میں کی گئی غلطیوں کو نہیں دُہرائیں گے، بلکہ نئے سِرے سے نئی نئی غلطیاں کریں گے۔ اَزل سے یہ فطرتِ خاکی رہی ہے۔ اور...... یہ خاکی اپنی فطرت میں......

(مئی، دو ہزار آٹھ)

کچھ تفریح، کچھ معلومات
INFOTAINMENT

کلون پلانر (Clone Planner) کی تاویل

''مزاح میں عام معلومات کو شامل کیا جائے تب بھی اُس کی شوخی اور برجستگی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ مصنف نے ایسی ہی ایک کوشش اِس باب میں کی ہے۔''

دُم سا نہیں دیکھا

کہتے ہیں کہ دُم میں کچھ نہیں ہوتا، یعنی دُم میں دَم نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہر جانور کے ساتھ یہ دُم کی طرح لگی ہوتی ہے۔ دُم کا سرا پکڑ کر جب ہم نے سوچنا شروع کیا تو لٹکتے، جھولتے اِس نتیجے پر پہنچے کہ دُم کے ہونے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جانور اَب یہاں آکر ختم ہو چکا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ جانوروں کی ستر پوشی اور مکھیاں اُڑانے کا کام بھی کرتی ہے۔ اور کبھی کوئی چشم بینا کسی جانور کی شناخت کو لے کر پس وپیش میں ہوتو یہ دُم ہی صحیح پہچان بتانے میں اُس کی مدد کرتی ہے۔ لیکن کبھی وہ دَم سادھے گھوڑے کی پچھاڑی سے اُسے پہچاننے کی غلطی کرے تو گھوڑا ہتھے سے اُکھڑ جاتا ہے اور بلا سمجھے بوجھے عینی شاہد کا دَم اُکھاڑ دیتا ہے۔

دُم اور دَم، دیکھنے میں ایک جیسے، اگر فرق ہے تو بھی ہاتھی کی دُم برابر۔ دُم کی دال زیرِ پیش اور دَم کی دال زیرِ زبر ہوتی ہے۔ ویسے جب دُم کا ذکر آتا ہے تو کُتا پیش پیش ہوتا ہے اور اُس کی دُم زیرِ بحث ہوتی ہے (بحث اکثر ٹیڑھے موضوعات پر ہی ہوتی ہے، جس میں ایک دوسرے کو زیر کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے)۔

بے چارے کُتے کا دَم نکل جاتا ہے، مگر اُس کی ٹیڑھی دُم...... مزید ٹیڑھی نہیں ہوتی۔ ہمیں

تو اِس کتے کے بچے کی ٹیڑھی دُم کا محاوروں اور ضرب الامثال میں استعمال کے علاوہ کوئی مصرف نظر نہیں آتا۔ ہمارے دوست پُر جوش پُوری کہتے ہیں کہ وہ اسی کو ہلا کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیتا ہے، اور جب مالکان اِس پر تکیہ کر کے سوتے ہیں تو یہ اُونگھتے سُونگھتے، نگہبانی کرتے ہوئے دُم ہلا ہلا کر اپنی خبرداری کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ عافیت اِسی میں ہے کہ یہ ہلتی رہے، ایسا نہ ہو کوئی دُم پر پاؤں رکھ دے۔ اِسی لیے کتا جب موت کی نیند سو رہا ہو تب بھی...... 'حرکتِ کلب' بند نہیں ہوتی۔

ایک جانور ٹیڑھا...... جس کا سیدھا سیدھا رشتہ ہم انسانوں سے بتایا جاتا ہے۔ یہ اپنی دُم سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتا ہے، جھٹکنے سے لے کر لٹکنے تک۔ اِس کی دُم اِس کا تیسرا ہاتھ ہوتا ہے یا تیسری ٹانگ ہوتی ہے، جسے یہ جا بجا اُڑاتا رہتا ہے۔ چوں کہ بندر ایک مصروف ترین جانور ہے، اِس کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو تب بھی یہ بہت کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ فراغت میں بھی اِسے سَر کھجانے 'سے' فُرصت نہیں ملتی۔ اپنا نہیں تو ساتھی بندر کا سَر کھجا کھجا کر اُس کے کان پر رینگنے کے لیے ایک بھی جُوں نہیں چھوڑتا۔ ایسے میں بندر کی دُم ایک اہم موقع پر اُس کا ساتھ دیتی ہے۔ دُم کا پھندا درخت کی شاخ میں ڈال کر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی نقل اُتارنے والوں کی نقل اُتارتا ہے۔

کینگرو کی دُم اُتنی ہی لمبی ہوتی ہے جتنا لمبا کینگرو خود ہوتا ہے۔ یعنی اگر کہیں سے کینگرو نکل جائے اور اُس کی دُم رہ جائے تو ہم کہیں گے کہ آدھا کینگرو وہاں رہ گیا ہے۔ اڑتالیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جَست لگانے والا یہ جانور اِسی مضبوط دُم سے اپنا توازن برقرار رکھتا ہے۔ اِس پر پُر جوش پُوری حیرت کا اظہار یوں کرتے ہیں، ''واہ بھئی! کیا دَم دار دُم ہے!''

چھپکلی کی دُم کٹنے کے بعد بھی کچھ دیر تک تڑپتی رہتی ہے۔ بندہ اِسے دیکھ کر دَم بخود رہ جاتا ہے۔ چھپکلی جب چاہے اپنی دُم کو اپنے جسم سے علیٰحدہ کر سکتی ہے، جب کہ چُوہے کی دُم چھپکلی کی دُم سے قدرے مضبوط ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک طرف سے آپ زور لگائیں اور دوسری طرف سے چُوہا، تو دُم اُکھڑ بھی سکتی ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے چُوہے کا تعاقب کرتے ہوئے اُس کی دُم پر پاؤں رکھا۔ اُس نے تڑپ تڑپ کر زور لگایا اور وہیں...... دُم توڑ کر نکل گیا۔

مچھلیاں اور دیگر آبی جاندار اپنی دُم کو تیراکی اور رُخ بدلنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

آبی جاندار سے یاد آیا کہ شکاریات کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ برازیل میں دریائے امیزن کے کنارے رہنے والے مقامی باشندے، چھوٹے مگر مچھ زندہ پکڑ کر گھروں کے سامنے رسیوں سے باندھ دیتے ہیں اور حسبِ ضرورت تھوڑی تھوڑی دُم کاٹ کر کھاتے رہتے ہیں۔ اِس عمل کے دوران مگر مچھ زندہ رہتا ہے۔ جب پوری دُم ختم ہو جاتی ہے تو مگر مچھ کو مار کر بڑی دعوت کرتے ہیں۔ اِس پر پُر جوش پُوری کہتے ہیں، ''وہ لوگ مگر مچھ کو دُم سے قسطوں میں ذبح کرتے ہیں۔ ایک دَم سے ذبح نہیں کرتے۔''

ہاتھی دوڑتے وقت یا کسی خطرے کی صورت میں اپنی چھوٹی سی دُم کو علم کی طرح اُٹھائے رکھتا ہے، تاکہ بے تحاشا دوڑنے میں کہیں اَٹک نہ جائے، لیکن اتنی چھوٹی دُم اُس کے شایانِ شان نہیں۔ اگر دُم بھی سونڈ کے برابر ہوتی تو اُس سے ایک وقت میں دو......دو شہتیر اُٹھوائے جا سکتے تھے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اِس میں بھی خیر کا پہلو نکلتا ہے، کیوں کہ اِتنی چھوٹی ہونے کے باوجود بھی یہ اکثر اَٹکی رہ جاتی ہے۔ دنیا میں بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن میں ہاتھی نکل جاتا ہے، مگر دُم اَٹکی رہ جاتی ہے اور اُسی دُم کے نکالنے میں انسان کا دَم نکل جاتا ہے۔ کبھی کبھی انسان کی پوری زندگی میں اُس کے مقصد کی صرف دُم ہی نکل پاتی ہے اور پورے کا پورا ہاتھی اَٹکا رہ جاتا ہے۔

(فروری، دو ہزار دس)

پیشہ اور پیشہ وَر

فارمایسٹ

اگر ناک میں دَم ہو تو آنکھوں کا ڈاکٹر دَوا نہیں کرتا۔ ہڈیوں کا ڈاکٹر دِل گُردے کا کام نہیں کرتا، لیکن ایک فارمایسٹ ہے کہ سَر سے لے کر پَیر تک کی دَوا ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے دے دیتا ہے۔ اُس کی بے چاری ایک ٹانگ، نہ جانے کتنے بے چاروں کی ایک ٹانگ قبر میں لٹکائے رکھتی ہے۔ فارمایسٹ کو لوگ ڈاکٹر کا نعم البدل سمجھتے ہیں۔ اُنہیں اُس کے پاس آ کر یہ اطمینان رہتا ہے کہ وہ اُن کے ٹیسٹ نہیں کروائے گا۔ اُنہیں اسپتال میں اپنا مہمان بنا کر تین دِن ......عیش / کیش نہیں کرائے گا۔

فارمایسٹ کے بارے میں ہماری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ وہ مرض کی دَوا کرتا ہے یا اپنی دوائیں بیچتا ہے۔ اکثر ہم نے دیکھا ہے کہ وہ نئی نئی کمپنیوں کی نئی نئی دواؤں کے تجربے نئے مریضوں پر کرتا رہتا ہے۔ اِس دَوا سے آرام نہیں مِلا...... یہ لو! اِس سے بھی نہیں مِلا...... یہ لو!

فارمایسٹ کو اپنے گاہکوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ دواؤں کے نام یاد نہیں رکھتے۔ دوا کی قیمت بتاتے ہیں۔ پیکٹ یا شیشی کا رنگ بتا دیتے ہیں۔ گولیوں کی شکل اور تعداد بتا دیتے ہیں۔ اُن کا ذائقہ تک بتا دیتے ہیں، لیکن دَوا کا نام نہیں بتاتے۔ فارمایسٹ کہتے ہیں کہ ایسے

گاہکوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام دینے والی گولی دینے کو دل کرتا ہے۔

لوگ نہ جانے اپنی جان کے اِتنے دشمن کیوں ہوتے ہیں؟ وہ اپنا علاج ڈاکٹروں سے کرانا ضروری نہیں سمجھتے۔ جب کہ اُن کی گاڑی میں اگر کوئی تکنیکی خرابی ہو تو اُس کی مرمت کے لیے وہ اِسپئیر پارٹس کی دکان پر نہیں جاتے، بلکہ مختلف قسم کی خرابیوں کے لیے مخصوص نوعیت کے ماہرین کے پاس ہی جاتے ہیں۔ شاید اِس لیے کہ گاڑی اپنی جیب سے خریدی ہوئی ہوتی ہے اور جان تو مفت میں ملی چیز ہوتی ہے!

ڈاکٹر، اسپتال اور علاج

آج کل تو اسپتال والے سب سے پہلے جیب کا آپریشن کرتے ہیں۔ پہلے ایڈوانس! کیا ضمانت ہے کہ مرنے کے بعد تمہاری بل ادا کرنے کی استطاعت ہو نہ ہو۔ اکثر ڈاکٹر آپریشن کے دوران کچھ چیزیں مریض کے پیٹ میں بھول جاتے ہیں۔ گویا پیٹ نہ ہُوا 'بھول دان' ہُوا۔ ہمارے دوست پُرجوش پُوری بڑا مفید مشورہ دیتے ہیں، ''ایسا ہونا چاہیے کہ آپریشن میں کام آنے والے آلات اور تولیے وغیرہ ڈاکٹر اپنی جیب سے خریدے۔ یوں وہ اپنی چیزوں کا دھیان رکھے گا۔ مریض کا پیٹ یا سینہ سینے سے پہلے ایک ایک چیز گِن لے گا۔'' ویسے انسان کی یادداشت پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جملہ آلاتِ جرّاحی، قابلِ تحلیل مواد سے تیار کیے جائیں۔ پھر کیا ہے! آپریشن کے بعد مریض کو 'رفعِ آلات' کی ایک گولی دے دی جائے!

ایک مرتبہ پُرجوش پُوری اپنے دوست کو آپریشن کے لیے اسپتال لے گئے۔ آپریشن کے بعد اُن کے دوست کے پیٹ میں موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ پُرجوش پُوری نے دوڑ کر نَرس کو بُلایا۔ نَرس نے ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا سَر پر رکھ کر کہا، ''شور کیوں مچاتے ہو؟ جب بیٹری ختم ہو جائے گی، موبائل خود بخود خاموش ہو جائے گا۔'' دوسری نَرس نے ڈاکٹر صاحب کو دَوڑ کر اور ہانپتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی کہ اُن کا موبائل انسان کے پیٹ میں بھی نیٹ وَرک پکڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب دوڑے دوڑے آئے۔ پُرجوش پُوری، جو پہلے ہی غصّے سے بھرے پڑے تھے۔ ڈاکٹر پر برس پڑے، ''موبائل سائلنٹ رکھنے کا بھی خیال نہیں آیا آپ کو۔''

ڈاکٹر نے جواب دیا، "شکر ہے کہ میں نے سائلنٹ نہیں رکھا، ورنہ میرے موبائل کا پتا ہی نہیں چلتا۔ چلو! مریض کا پیٹ پھاڑو! لیکن پہلے رِنگ کر کے دیکھ لو کہ یہ میرا ہی موبائل ہے یا کسی اور کا۔ اگر کسی اور کا نکلا تو محنت بے کار چلی جائے گی۔" پُر جوش پُوری روہانسے ہوکر بولے، "کسی کا بھی ہو، آپ کو مریض کے پیٹ سے موبائل نکالنا ہی ہوگا۔ کوئی بے چارہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو رہا ہوگا۔"

ٹیچر

ایک زمانہ تھا کہ اُستاد کو واقعی اُستاد سمجھا جاتا تھا۔ اور اَب...... 'اُستاد کہیں کا' سمجھا جاتا ہے۔ ہم اُس اُستاد کی بات کر رہیں جس کو سب 'ٹیچر' کہتے ہیں۔ وہ جو پوری کلاس کو کچھ دل سے اور کچھ دماغ سے پڑھاتا ہے۔ اسٹاف رُوم میں ٹیچر وہ سارے کام کر لیتے ہیں جن کے کرنے کے لیے گھر پر مُوڈ نہیں بنتا۔ اور اسٹاف روم میں جب کبھی آرام کر کر کے تھک جاتے ہیں تو کلاس روم میں جا کر طلبا کے آرام میں خلل ڈالتے ہیں!

بیشتر والدین اساتذہ کی کارکردگی سے ناخوش رہتے ہیں۔ انہیں یہ شکایت ہوتی ہے کہ اساتذہ بچوں کو سال بھر پڑھاتے ہیں اور آخر میں صرف ایک ہی بچہ اوّل آتا ہے۔ اساتذہ کو یہ گلا رہتا ہے کہ والدین بچوں کو گھر پر نہیں پڑھاتے۔ اگر تمام والدین گھر پر ہی بچوں پر محنت کریں تو ہر بچہ اپنی جگہ اوّل آئے۔

اساتذہ کو انتظامیہ سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ اِتنی کم تنخواہ دیتی ہے کہ اُس میں تو صرف ٹیچر ہونے کی اَداکاری ہی کی جاسکتی ہے۔ اسکول میں ٹیچر کا آدھا وقت پوری کلاس کا ہوم وَرک چیک (check) کرنے میں گزر جاتا ہے اور باقی آدھا وقت، نیا ہوم وَرک دینے میں کھپ جاتا ہے۔ ایسے میں اگر بچوں کو ٹیچر سے کچھ سیکھنا ہو تو یہ کام اسکول کے اوقات میں ممکن نہیں، البتہ اسکول کے اوقات کے علاوہ چند گھنٹوں میں کتابیں گھول کر پلائی جاسکتی ہیں۔

ٹیچر کہتے ہیں کہ صبح صبح نیند کے نشے میں چُور بچے جب اسکول پہنچتے ہیں تو ہم ہی اُن کی آنکھیں کھولتے ہیں۔ رات گئے تک والدین کے ساتھ اَدھ کھلی آنکھوں سے جاگتے یہ بچے اسکول

میں جھوم جھوم کر اپنی نیند پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں چیخ چیخ کر اُنہیں خوابوں کی دنیا سے کلاس روم میں واپس بُلانا پڑتا ہے۔ بچے ہم سے نالاں رہتے ہیں کہ ہم اُن کی نیند حرام کرتے ہیں، لیکن جیسے ہی اسکول کی چھٹی ہوتی ہے تو پتا نہیں کیسے اُن کی نیند بھک سے اُڑ جاتی ہے۔ والدین اگر گھر سے ہی بچوں کو دماغ کے دروازے کھول کر اسکول بھیجیں تو ہم اُن میں علم کے خزانے داخل کریں۔ بند آنکھیں، بند دماغ اور خالی پیٹ لیے بستے کا بوجھ ڈھو کر آئے بچوں کو ہم کیا پڑھائیں، کیا سکھائیں؟

فائر بریگیڈ اور فائرمین

فائر بریگیڈ والے جلنے پر پانی چھڑکتے ہیں۔ تب جو چیز جلنے سے رہ جاتی ہے، وہ بھیگ کر رہ جاتی ہے اور جس کے ہاں آگ لگتی ہے، وہ بے چارہ جل کر رہ جاتا ہے، اُس کی آنکھیں بھیگ کر رہ جاتی ہیں۔ فائر بریگیڈ والے کبھی آگ لگنے سے پہلے نہیں پہنچتے۔ پہلے پہنچیں تو کیا خاک آگ بجھائیں۔ وہ ٹریفک میں شور مچاتے، راستہ بناتے ہوئے 'موقع آگدات' پر اُس وقت پہنچتے ہیں جب آگ......آگ اُگل رہی ہوتی ہے۔

فائر بریگیڈ والے اپنے مراکز وہاں نہیں بناتے جہاں بات بات پر آگ لگتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو اُنہیں سائرن بجانے اور ٹریفک کو بتر بتر کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اور لوگوں کو یہ پتا بھی نہ چلے کہ کہیں آگ لگی بھی ہے۔ یوں بھی موقع پر فائر بریگیڈ والوں سے پہلے میڈیا والے پہنچ جاتے ہیں اور آگ کو وہ ہَوا دیتے ہیں کہ پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ ہمارے کلون پلانر (Clone Planner) کہتے ہیں کہ جب کہیں آگ لگے، تب اُس حصے پر پانی چھڑکا جائے جو اُبھی جلا نہیں ہے۔ اِسی لیے آگ بجھانے والا عملہ آگ بجھانے کے ساتھ ساتھ آس پاس کی عمارتوں پر بھی پانی کی بوچھار کرتا ہے۔ اِس پر پُر جوش پُوری ہنس کر بولے، ''لو اور سُنو! یہ پانی سے کھیلنے کی بات کر رہے ہیں۔ اُن بے قصور عمارتوں کو گیلا کرنے کا کیا فائدہ؟'' ہم نے اُنہیں سمجھایا ، ایسا اِس لیے کیا جاتا ہے کہ آگ کے مزید پھیلنے کا امکان باقی نہ رہے۔ لیکن ہمارا یہ سبق نقصان دہ ثابت ہوا۔ ایک مرتبہ پُر جوش پُوری کے ذاتی کتب خانے میں آگ لگ گئی۔ اُنہوں نے آؤ دیکھا

نہ تاؤ۔ اپنے آدھ درجن بچوں سمیت آگ پر پانی ڈال کر ساری کتابوں پر پانی پھیر دیا۔ پلانر کہتے ہیں کہ کتب خانوں، سرکاری اور نجی دفاتر میں لگی آگ کو خاص قسم کے سفوف سے بجھایا جاتا ہے۔ تا کہ جو کتابیں اور دستاویز جلنے سے بچ جائیں، وہ بھیگنے سے بھی محفوظ رہیں۔ پلانر نے ہماری معلومات اور خوشی میں اضافہ کرنے کے لیے ایک خبر سنائی کہ بعض ممالک اب خواتین کو بھی فائر ڈپارٹمنٹ میں بھرتی کر رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر پُر جوش پوری جَل کر بولے،''اب عورتیں آگ بجھائیں گی بھی!!!''

آگ اکثر ایسی جگہوں پر لگتی ہے جہاں فائر ڈپارٹمنٹ کی گاڑیاں گُھس نہیں سکتیں۔ گاڑیاں تو کیا؟ ایسی گلیوں سے میت کو بھی کھڑا کر کے گزارا جاتا ہے۔ یعنی دنیا سے ایک جھٹکے میں گزرنے والا اِن گلیوں سے ایک چنکی میں نہیں گزر سکتا۔ ایسی جگہوں پر جو مکانات ہوتے ہیں اُن میں سے چھلانگ لگانے کو ایک تو کھلی کھڑکی نہیں ملتی۔ اور اگر مل بھی جائے تو وہاں سے ٹپکا بندہ...... بجلی اور ٹیلی فون کے تار میں اُٹک کر رہ جاتا ہے۔

سب سے زیادہ آگ جھونپڑیوں میں لگتی ہے۔ اُن کے جلنے کے لیے ایک چنگاری ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک جگہ بھڑ کے تو پوری بستی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ پھر نہ چولہا رہتا ہے نہ چاردیواری اور نہ سَر پر چھت۔ پھر وہ بے گھر اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ راکھ جھاڑ کر دوبارہ گھر بنائیں یا پیٹ کی آگ بجھائیں؟

جنگل کی آگ بھی تباہ کُن ہوتی ہے۔ ایک پتّا کسی پتّے سے کیا ٹکرایا کہ...... پتّا پتّا، بُوٹا بُوٹا جل کر راکھ ہو گیا۔ امریکا، کناڈا اور آسٹریلیا جیسے ممالک اِس کی روک تھام کے لیے سالانہ لاکھوں ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ اِس کے باوجود آگ ہے کہ جنگلوں کا سکوت اُس سے دیکھا نہیں جاتا۔ وہ جنگلوں سے اِتنی 'جلتی' ہے کہ ٹھکانے بے ٹھکانے بھڑکتی رہتی ہے۔

پلانر کہتے ہیں کہ جہاں آگ لگے اُس جگہ سے جتنی جلدی ہو سکے دور نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ صرف جھلسنے سے ہی انسان کی موت ہو سکتی ہے، بلکہ گھٹن سے بھی چند منٹوں کے اندر اندر انسان کی جان جا سکتی ہے۔ پلانر کا مشورہ ہے کہ اہم دستاویز، جائداد کے

کاغذات اور سرٹیفکیٹس وغیرہ ایک بریف کیس میں رکھیں، تاکہ ہنگامی صورتِ حال میں اُسے اُٹھایا اور چل دیے۔ اِس پر پُرجوش پُوری نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، ''اچھا! جلو تو دستاویز کے ساتھ جلو!''

ایک مرتبہ پُرجوش پُوری کے کارخانے میں آگ لگ گئی، آگ بجھانے والا عملہ موقع پر پہنچا۔ پھر آگ اور پانی کا کھیل شروع ہوا۔ ہمیں کارخانے کے اندر پھنسے پُوری صاحب کی فکر ستانے لگی کہ کہیں آگ سے کھیلنے تو نہیں لگ گئے۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ ایک فائرمین کو اپنے کاندھے پر اُٹھائے باہر آرہے ہیں! ہم نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ بولے، ''کافی دیر سے یہ مجھے اپنے کاندھے پر اُٹھائے باہر آنے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے کہا، ایسا کرو تم مجھے نیچے اُتار دو! میں یہاں کے چپّے چپّے سے واقف ہوں۔ سو...... یہ جھٹ میرے کاندھے پر لَد گیا۔'' ہم نے کہا، ''آپ نے کھڑکی سے چھلانگ کیوں نہیں لگائی؟'' وہ بولے، ''میں نے بہت کوشش کی، مگر یہ فائر بریگیڈ والے پانی کی بوچھار روکیں تب راستہ کھلے۔ آگ سے بچنے والے کو یہ پانی سے مار دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرے دوست نے آگ سے بچنے کے لیے تین منزلہ عمارت کی دوسری منزل سے چھلانگ لگائی۔ فائر بریگیڈ والوں نے اُسے پانی کی بوچھار سے ٹیرس پر پہنچا دیا۔''

پولیس...... چور

کسی بچے سے جب پوچھو کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ تو وہ کہتا ہے کہ میں انجینیئر بنوں گا، ڈاکٹر بنوں گا۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں بڑا ہو کر پولیس بنوں گا۔ شاید بچوں کو یہ ڈر ہو کہ پولیس بنیں گے تو مزید بڑے نہیں بنیں گے۔

پولیس اُس کو کہتے ہیں جو لوگوں کو قانون ہاتھ میں لینے سے تو روکے، مگر قانون توڑنے سے نہیں! ایک مرتبہ چند لوگوں نے ایک چور کو رَنگے ہاتھوں پکڑ کر وہ مارا کہ اُس کا بھُرکس نکال دیا۔ اپنے اُصول کے مطابق پولیس 'دیر آید درشت آید' اور کہا، ''ہم کس لیے ہیں؟ جب بھی آپ کے ہاتھ کوئی ایسا چور لگے تو اُسے ہمارے حوالے کر دیا کریں۔ ہم اُسے ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ آئندہ چوری کرنے سے پہلے سَو بار سوچے گا۔ لیکن آپ لوگ مار مار کر اُس کا وہ حال کر دیتے ہیں

کہ بے چارہ آئندہ چوری کرنے کے لائق ہی نہیں رہتا!'' ایک مرتبہ ہم نے اور پُر جوش پُوری نے مِل کر ایک چور کا انٹرویو لیا۔

ہم نے پوچھا،'' تمہارا نام؟......اصلی نام بتاؤ۔''

''ایک ہو تو بتاؤں۔'' چور نے جواب دیا،'' اور اصلی نام تو مجھے خود پتا نہیں، پولیس والوں کو بھی نہیں۔''

ہم نے پوچھا،'' تم نے چوری کرنا کب سے شروع کیا؟''

''بچپن سے۔'' چور نے کن انکھیوں سے اپنے ماضی میں گھورتے ہوئے کہا،'' جب میں چھوٹا تھا تب میں اپنے گھر کے باورچی خانے میں چھوٹی موٹی وارداتیں انجام دیا کرتا تھا۔ میرا یہ شوق بڑھتا گیا، پھر میں نے گھر سے باہر وارداتیں کرنا شروع کر دیں۔ اور آج اِس مقام پر ہوں کہ آپ میرا انٹرویو لے رہے ہیں!''

اگلا سوال پُر جوش پُوری نے پوچھا،'' کیا تم کبھی جیل بھی گئے ہو؟''

''دیکھیں!'' اُس نے پُر جوش پُوری کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور کہا،'' چور جب تک جیل نہ جائے وہ پختہ چور نہیں کہلاتا۔ جیل جانا آنا تو لگا ہی رہتا ہے۔ اِس بہانے ہم اپنے دوستوں سے مل بھی لیتے ہیں اور جیل میں فارغ بیٹھے اپنے اُستادوں سے نئے نئے گُر بھی سیکھ کر آتے ہیں۔

''پُر جوش پُوری نے پوچھا،'' کیا چوری کرتے وقت تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

'' فُو وووووو ں''......اُس نے سگریٹ کا دُھواں پُر جوش پُوری کے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا، ''چوری اور ڈر کا، چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر ہم ڈریں تو چوری نہ کریں، اور نہ ڈریں تو ہر واردات میں پکڑے جائیں۔''

ہم نے پوچھا،'' کوئی دلچسپ واقعہ تمہاری زندگی کا؟''

''صاب! میری تو پوری زندگی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ایک رات میں نے ایک گھر میں چوری کے ارادے سے کمپاؤنڈ وال سے چھلانگ لگائی۔ اندھیرے میں مجھے یہ پتا نہ چل سکا کہ دیوار کے ساتھ ایک کنواں بھی ہے۔ میں نے جو چھلانگ لگائی تو سیدھا کنویں میں گیا۔ مَیں حیرت میں پڑ گیا کہ باہر سے تو دیوار اتنی اُونچی نہیں تھی۔ اندر سے اِتنی گہری کیسے ہوگئی۔ دائیں

ہاتھ مارا، بائیں ہاتھ مارا،لیکن میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ایسا کم ہی ہوا ہے کہ میں نے کہیں ہاتھ مارا ہو اُور میرے ہاتھ کچھ نہ آیا ہو۔ مجھے لگا کہ کہیں میرے پیروں کے نیچے سے زمین تو نہیں نکل گئی۔ آخر کار، میری چھلانگ کا طویل سفر پانی کی سطح پر جا کر ختم ہوا۔ تب مجھ پر یہ راز کھلا کہ مَیں کنویں میں آ گرا ہوں۔ رات بھر میں کنویں میں خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ صبح ہوتے ہی گھر کے مالک نے پولیس کو طلب کر کے مجھے رنگیلے ہاتھوں پکڑوایا۔''

ہم نے کہا،''نوجوانوں کے لیے کوئی پیغام۔''

''نوجوانوں کے لیے یہ پیغام دینا چاہوں گا کہ چوری چوری جو بھی کام کیا جائے اُس میں مزہ تو بہت آتا ہے،لیکن وہ مزہ وقتی ہوتا ہے۔ انسان ایک مرحلے سے گزرتا ہے پھر کچھ نیا چاہتا ہے۔ چور کبھی اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ چھوٹی وارداتیں، پھر بڑی......اور بڑی۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ چوری کے ہزار طریقے ہیں۔ چوروں کے ہزار چہرے ہیں۔ کئی سفید پوش بھی دَرپَردہ طرح طرح کی چوریاں کرتے ہیں،لیکن ایک نہ ایک دن سب کنویں میں گرتے ہیں۔''

(اگست، دو ہزار آٹھ)

ہُشیار باش!!!

کہتے ہیں کہ یہ 'نیا' دَور ہے۔ ہم سے پہلے کے لوگ بھی اپنے دَور کو 'نیا' کہتے تھے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ موجودہ دَور کے نئے پن کے لیے، لفظ 'نیا' کی جگہ کوئی اور 'نیا' لفظ تلاش کرنا ہوگا، کیوں کہ جتنی ترقی اِس دَور میں ہوئی ہے، اِس سے پہلے کسی بھی دَور میں نہیں ہوئی۔ نئے دَور کی ایجادات کی افادیت کے ساتھ ساتھ اُن کے نقصانات اور اُن کا غلط استعمال بھی ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اِن ایجادات میں سے ایک ایجاد کیمرا (Camera) ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیت کو نکھارتا آ رہا ہے۔ اور جُوں جُوں اِس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے، اِس کی جسامت بھی چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ چالاک ہو گیا ہے۔

اِس ایک آنکھ والی بَلا سے ہمیشہ ہوشیار رَہیے۔ نہ جانے کب اور کہاں یہ آپ کی پوشیدہ حرکتوں کو اپنے ذہن میں قید کر لے اور اُس منظر کو اُن بے شمار آنکھوں تک پہنچا دے جو اُس وقت وہاں نہیں تھیں۔ موبائل فون کے علاوہ یہ کیمرے نہ معلوم کِن کِن شکلوں میں آپ کی تاک میں رہتے ہیں۔ گھڑی کے ڈائل، قلم، سگریٹ لائٹر اور عجب نہیں کہ کانٹیکٹ لینس (Contact-lense) میں بھی!

ہوشیار رَہیے!!! ریڈی میڈ کپڑوں کی دکانوں کے چینجنگ رُومز میں۔ ہوٹلوں کے کمروں میں، جہاں ٹیوب لائٹ کے ساتھ یہ کیمرے لگے ہوتے ہیں۔ اور کچھ اعلیٰ کارکردگی کے حامل کیمرے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے بھی چھپائے جاتے ہیں، جو آئینے کو چیر کر وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جسے دیکھنے کی اجازت چشمِ فلک کو بھی نہیں! چینجنگ رُومز میں اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے سے ایک عام سا کیمرا بھی آپ کی سُن گُن لے سکتا ہے۔ وہ اِس طرح کہ آئینے کی پچھلی سطح پر لگائی گئی ریڈ آکسائیڈ (Red Oxide) کی پَرت کو ذرا سا کُھرچ دیا جائے تو وہ حصہ ایک شفاف شیشے کی طرح ہو جاتا ہے۔ جس کے پار بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

ہوشیار رَہیے!!! اپنے ہوسٹل میں اور اُس کے طہارت خانوں میں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا کوئی دوست ہی آپ کو اِس جال میں پھانس لے۔ ہوشیار!!! خواتین کے لیے مخصوص سوئمنگ پُولز میں، جہاں زُوم لینز کیمرے، پانی کی چادر سے ڈھکے نیم عریاں جسموں کی حرکات و سکنات کو ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

بیوٹی پارلرز؛ یوں تو بُری جگہ نہیں ہوتی، لیکن کچھ بیوٹی پارلرز 'فریب خانے' ہوتے ہیں، جو ایسے ہی منفی مقاصد کے لیے چلائے جاتے ہیں۔ خواتین وہاں احتیاط اختیار کریں، خصوصاً ایک لباس سے دوسرے لباس میں منتقل ہوتے وقت۔ بے قبائی کے وہ لمحات کہیں رُسوائی کا سبب نہ بن جائیں۔

کچھ عرصہ قبل ایک ایسا ہی معاملہ سامنے آیا کہ ایک شخص نے اپنی عمارت کا ایک فلیٹ چند لڑکیوں کو کرایے پر دے رکھا تھا۔ وہاں اُس نے ایک چھوٹا سا کیمرا ٹیوب لائٹ کے چوک کے ساتھ چھپا دیا تھا۔ اور اُسے ایک تار کے ذریعے اپنے کمپیوٹر سے جوڑ دیا تھا۔ بے خبر لڑکیاں یہ سمجھتی رہیں کہ اُنہوں نے کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کر کے خود کو چار دیواری میں چھپا لیا ہے۔ اِس قسم کے خفیہ کیمرے اکثر تیز روشنی والے ٹیوب لائٹس یا بلب کے پیچھے چھپائے جاتے ہیں، تاکہ انسانی آنکھ اِن سے آنکھ نہ مِلا سکے۔ اور یہ 'بدنیت' کیمرے خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ یہ کیمرے صرف اُجالے میں ہی اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ بلکہ کچھ

'اُلّو صِفت' کیمرے تو اندھیرے میں بھی اپنا کام کر جاتے ہیں۔

وقتی طور پر ایسے کیمروں کی آنکھ پر پَردہ ڈالنے کے لیے ایک آسان ذریعہ 'چیونگ گم' (Chewing Gum) ہے۔ اُسے اچھی طرح چَبا کر کیمرے کی 'بے حیا' آنکھ پر چپکا دیا جائے۔ اور اگر آپ کے پاس فرصت ہے تو قانونی چارہ جوئی کیجیے۔ جو خود کسی چیونگ گم سے کم نہیں۔ چَباتے رَہیے! چباتے رَہیے! ختم ہی نہیں ہوتی۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ کہاں کہاں ایسے کیمرے آپ کا پیچھا کر سکتے ہیں۔ جہاں آپ پڑھتے ہیں اور جہاں کام کرتے ہیں۔ سوئمنگ پُولز میں اور وہاں کے شاور رُومز میں۔ ہیلتھ کلب میں اور وقتی طور پر لیے گئے کرایے کے مکانات میں۔ نہ جانے کہاں کہاں ایسے کیمرے آپ کو نظر آ سکتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ نہ جانے کہاں کہاں ایسے کیمروں کو...... آپ...... نظر آ سکتے ہیں اور بلیک میل ہو سکتے ہیں۔

تو...... اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھیے، ورنہ یہ ایک آنکھ......

(جنوری، دو ہزار چار)

اَنڈا اسکوپی

(انڈے اور مُرغی پر ایک سیر حاصل بحث)

اَنڈا بھی ایک بے زبان جانور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چل پھر نہیں سکتا، لیکن اِس کو ذرا سی گرمی دی جائے تو اِس میں سے کوئی چلتا پھرتا نظر آ سکتا ہے۔ اَنڈے کی شکل بیضوی ہوتی ہے۔ یہاں ایک سوال قابلِ غور ہے کہ کیا اَنڈے کی بھی کوئی شکل ہوتی ہے؟ ویسے ہم نے دیکھا ہے کہ اَنڈے پر دو آنکھیں، ناک اور منہ بنا کر ایک شکل بنائی جاتی ہے، جس سے بد شکل چھپکلیوں کو ڈرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مُرغی کے ہاں ہر روز ایک انڈا پیدا ہوتا ہے۔ اِس حساب سے دنیا میں سب سے زیادہ آبادی اَنڈوں کی ہوئی۔ اگر دنیا کی بیشتر مرغیاں سونے کے اَنڈے دیتیں تو سونے کا بھاؤ انڈے کے برابر ہو جاتا اور اَنڈا سونے کے بھاؤ بِکتا۔ اَنڈا کبھی اپنے بَل پر سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اُسے کہیں رکھو تو لُڑھک لُڑھک جاتا ہے۔ اَنڈے کو اگر پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا جائے تو وہ صفر کا ہم شکل نظر آتا ہے، اسی لیے جب صفر کی بات نکلتی ہے تو انڈے کا ذکرِ خیر ہوتا ہے۔

پتا نہیں مُرغی کے پیٹ میں پیکنگ کا کون سا ایسا نظام ہوتا ہے جو وہ انڈے کو اِتنے خوب صورت اور نفیس کیپسول کی شکل میں برآمد کرتی ہے۔ یہ اُس وقت سے ہو رہا ہے جب مُرغی کو یہ پتا

بھی نہیں تھا کہ انڈا کیا چیز ہوتی ہے۔ قدرت نے مُرغی کے بطن سے سیدھے مُرغی پیدا نہیں کی۔ پہلے انڈا پیدا کر کے ہمیں یہ اختیار دیا کہ انڈا کھاؤ! اگر انڈا کھانے کا موڈ نہیں تو تھوڑا انتظار کرو اور مُرغی کھاؤ!

ہمارے دوست پُرجوش پُوری انڈوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ اُن کے 'اَنڈازے' کے مطابق، دنیا میں سب سے زیادہ انڈے، انسان اور کوّے کھاتے ہیں۔ ان کے بعد بے وزن شعرا اور بے سُرے گلوکاروں کا نمبر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''اسکول کے زمانے میں مجھے وقتاً فوقتاً مُرغا بننے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ لیکن افسوس! استاد نے کبھی مجھے مُرغا نہیں جانا ۔ ہر بار اِتنی عمدگی سے مُرغا بننے کے باوجود وہ مجھے گدھا ہی سمجھتے تھے اور نتیجے میں کسی نہ کسی پرچے میں اَنڈا دیتے تھے۔''

مُرغیوں کے مقابلے میں مُرغوں کے پاس کرنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یوں بھی پولٹری کی صنعت میں اِنہیں بے مصرف سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہ انڈے دیتے ہیں نہ سیتے ہیں۔ نَر چوزوں کو اُن کے پیدا ہونے کے ۷۲ گھنٹوں کے اندر، گرائنڈر میں ڈال کر یا بجلی کے شاک (Electrocution) کے ذریعے قتل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مُرغے نہ ہوتے تو مُرغیاں بس کُڑک بیٹھی رہتیں۔ مُرغے؛ دو اَہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انڈے کی تخلیق میں اپنا فرض (اور کردار) ادا کرتے ہیں۔ دُوسرے...... بانگ دینے کے فرض کو اپنے اوپر واجب کر لیتے ہیں۔ گاؤں کے مُرغے جب بانگ دیتے ہیں تب 'اپنے اپنے' گھوڑے بیچ کر سورہے لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اب ہمیں اُٹھنا چاہیے۔ اور شہروں میں 'ایک دوسرے کے' گھوڑے بیچ کر سورہے لوگ جب آنکھیں کھولتے ہیں تو پولٹری شاپ کے مُرغے کہتے ہیں کہ اب ہمیں بانگ دینا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھار بانگ دینا کچھ مُرغوں کی عادت بن جاتی ہے تو کچھ کو بانگ دینے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ ایسے مُرغوں کی ٹائمنگ اَپ سیٹ ہو جاتی ہے۔ اُن کا جب دل کیا، منہ اُٹھایا اور بانگ دے دی۔ ایسے مُرغوں کی ککڑوں کُوں سے تنگ آ کر لوگ اُن کے حلق پر چھری پھیر کر، اب کی، تب کی...... سب بانگوں کو اپنے حلق سے اُتار لیتے ہیں۔

مُرغی کا شمار جزوی طور پر پرندوں میں ہوتا ہے، جو پَر دار ہونے کے باوجود اُڑ نہیں سکتی۔ غنیمت ہے، مُرغی اُڑ نہیں سکتی، ورنہ اُس کو دبوچنے میں انسان کی جان نکل جاتی۔ جب کہ پُر پیچ خطوط پر چھپا چھپ دوڑنے والی مُرغی ہی ہمارے ہاتھ نہیں آتی۔ اُسے پکڑنے جھکو تو ٹانگوں کے بیچ سے نکل نکل جاتی ہے۔ ایک مرتبہ پُر جوش پُوری مُرغی کے پیچھے دوڑ لگاتے ہوئے، جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے، بے خیالی میں بہت دُور نکل گئے۔ جب تھک گئے تو دَم لینے کو رُکے۔ ہانپتے ہوئے پُر جوش پُوری کو دیکھ کر مُرغی بھی رُک گئی اور اُن کی بڑی بڑی آنکھوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ڈال کر سوچنے لگی کہ ''یونہی اکیلے اکیلے دوڑ لگانے کا کیا فائدہ۔'' پُوری جی کو ہم نے بار ہا سمجھایا کہ مُرغی کو پکڑنے کے لیے دانہ ڈالنا پڑتا ہے۔ دانہ نہ ڈالو تو مُرغی گھاس نہیں ڈالتی۔

ہر مُرغی کے سَر پر ایک کلغی ہوتی ہے اور گردن سے ایک جھالر لٹکی ہوتی ہے۔ ایک مُرغی کی کلغی دوسری سے جدا ہوتی ہے، جس سے مرغیاں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ پُر جوش پُوری کہتے ہیں کہ ایسی ہی کلغیاں چینیوں کے بھی ہونی چاہیے، تاکہ پتا تو چلے کہ اُن میں 'یہ چینی' کون ہے اور 'وہ چینی' کون۔

مُرغی پانچ مہینے کی عمر سے ہی انڈے دینا شروع کر دیتی ہے۔ اُس کے پیٹ میں انڈے کی تخلیق کا عمل تقریباً بیس گھنٹوں میں مکمل ہوتا ہے۔ ہائے بے چاری مُرغی! ایک انڈا دِیا نہیں کہ اَگلے کی تیاری شروع۔ اگر اُس کی پیشانی ہوتی تو ہمیں پتا چلتا کہ اُس کے ماتھے پر شِکن تک نہیں آتی۔ اور یہ کہ وہ کتنی 'اَنڈا پیشانی' سے انڈا دیتی ہے۔ (معاف کیجیے) وہ کتنی خندہ پیشانی سے انڈا دیتی ہے۔ (انڈے کا ذکر اِتنی کثرت سے ہو رہا ہے کہ بات بات پر منہ سے انڈا نکل رہا ہے) تو جناب! بے چاری مرغی معلوم ہی نہیں ہونے دیتی کہ اُس کے انڈا ہُوا بھی ہے۔ ہمیں خود اُس کی تخلیق کو 'دریافت' کرنا پڑتا ہے کہ کدھر دیا ہے؟ کہاں دیا ہے؟

ایک زمانے تک 'مَرغزار' کو ہم 'مُرغ زار' پڑھتے تھے اور اِس کا مطلب پولٹری فارم سمجھتے تھے۔ بلکہ کئی موقعوں پر ہم نے یہ لفظ استعمال کر کے اپنی زبان دانی کا رُعب بھی جھاڑا۔ رُعب بھی ایسا کہ اچھے اچھوں نے ہمارے آگے زانُوئے 'تلفُّظ' تہ کیا۔ لیکن جب ہمارے کلون پلانر (Clone

(Planner) کا ظہور ہوا تو ہمیں پتا چلا کہ اِس لفظ کے صحیح معنی ہیں...... سبزہ زار، ایسی جگہ جہاں دُور دُور تک ہری گھاس اُگی ہو۔ لیکن پُر جوش پُوری نے ہمیں ایک بار گمراہ کرنے کی کوشش کی اور مَرغزار کے یہ معنی بتائے کہ ایسی جگہ جہاں دُور...... دُور تک ہری ہری گھاس اُگی ہو، اور وہاں ہزار مُرغیاں چُگ رہی ہوں۔ ہم تو کہتے ہیں 'مرغزار' پر مرغیوں کا حق زیادہ بنتا ہے۔ پولٹری فارم کے متبادل کے طور پر اِس لفظ کو مُرغیوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ہری گھاس کے پاس تو پہلے ہی سبزہ زار کا لفظ موجود ہے۔ کسی کے پاس دو...... دو اور کسی کے پاس ایک بھی نہیں۔ یہ ہے اُردو کی حالتِ زار۔

انڈے سے ہوتے ہوئے بات اُردو کے مسئلے تک آ پہنچی، جو دنیا کے اُن پیچیدہ اور ٹھوسیدہ (جیسے پیچ سے پیچیدہ، ویسے ہی ٹھوس سے ٹھوسیدہ) مسائل میں سے ایک ہے، جن پر بات کرنا، انڈے اور مُرغی کی بحث کے مترادف ہے۔ جو صفر سے شروع ہوتی ہے اور گھوم پھر کر صفر پر ہی لَوٹ آتی ہے۔

✡✡✡

''جو ختم ہو کسی جگہ، یہ ایسا سلسلہ نہیں''

(جولائی، دو ہزار آٹھ)

مصنف ایک نظر میں!
نام : نادِر خان سَرگِروہ
والد کا نام : بدرالدین خورشید خان سَرگِروہ (سبک دوش ملازم، فوڈ کارپوریشن آف انڈیا)
آباو اَجداد : تُرک...... جنہیں فوج میں خدمات انجام دینے پر سنہ گیارہ سو نوّے ہجری میں سَرگِروہ (گِروہ کے سَردار) کے خطاب سے نوازا گیا
آبائی وطن : پیوے، تعلقہ گہاگر، ضلع رتنا گیری (کوکن) مہاراشٹر (بھارت)
تاریخِ پیدائش : 4 جولائی 1971ء
جاے پیدائش : ممبئی (مہاراشٹر، بھارت)
اسکول/ کالج : ایم ایچ صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ، ممبئی
مقیم حال : مکہ المکرمہ (سعودی عرب)
ای میل : nadirsargiroh@yahoo.com